Bachelor of Arts Program (B.A. Urdu)

DCEUR-102 (N) Urdu Zaban -o- Adab ki Tareekh (Vth Semester)

بلاک۱- چھٹا پرچہ: اردوزبان وادب کی تاریخ

اکائی۱: زبان،اس کی اہمیت اورزبان وبولی میں فرق

اکائی۲: اردوزبان کی خاندانی تشکیل اورابتداوارتقاکے مختلف نظریات

اکائی۳:اردواورہندی کاباہمی رشتہ

بلاک۲- اردوکی ترقی وترویج میں اہم اداروں اور جماعت کا حصہ:

اکائی۴: اردوکی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ

اکائی۵: اردوکی ترقی میں دہلی کالج کا حصہ

اکائی۶: اردوکی ترقی میں صوفیا کرام کا حصہ

بلاک۳-اہم شعری دبستانِ:

اکائی۷: اردوکی ترقی میں دبستانِ دہلی کا حصہ

اکائی۸: اردوکی ترقی میں دبستانِ لکھنو کا حصہ

اکائی۹: تحریکِ آزادی میں اردوادب کا حصہ(قومی اورحبّ الوطنی شاعری کے حوالے سے)

بلاک۴- اردوادب کی اہم تحریکیں:

اکائی۱۰: علی گڑھ تحریک

اکائی۱۱: ترقّی پسندتحریک

اکائی۱۲: حلقۂ اربابِ ذوق

اکائی (۱) : زبان اور اس کی اہمیت، زبان اور بولی میں فرق، اردو زبان کی خاندانی تشکیل

ساخت:

1.0 اغراض ومقاصد
1.1 تمہید
1.2 زبان کی تعریف
1.2.1 اظہار کی مختلف صورتیں
1.2.2 زبان کے خواص
1.2.3 زبانیں کیسے بنیں؟
1.3 زبان کی اہمیت
1.4 بولی اور زبان کا فرق
1.5 عالمی خاندان السنہ
1.6 ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور ان کی زبان
1.7 ہند آریائی کے ارتقائی مراحل
1.7.1 قدیم ہند آریائی دور
1.7.2 وسطی ہند آریائی دور
1.7.3 اپ بھرنش دور
1.7.4 جدید ہند آریائی دور
1.7.5 تہذیبی اختلاط
1.8 اردو کی خاندانی تشکیل
1.9 غیر ہند آریائی زبانیں
1.10 خلاصہ
1.11 مشکل الفاظ کے معنی
1.12 نمونہ امتحانی سوالات
1.13 مزید مطالعہ کے لیے نام زد کتابیں

☆☆☆

1.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد زبان کے تصور، زبان اور بولی کے فرق، زبان کی اہمیت اور دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں کی گروہ بندی سے واقف کرانا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان کی مختلف زبانوں کے درمیان اردو کی ابتدا اور نقطۂ آغاز کا پتہ لگانا ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ میں یہ استعداد پیدا ہو جائے گی کہ آپ:

- زبان کے تصور سے آگاہ ہو کر اس کی تعریف کر سکیں گے۔
- اظہار کے مختلف طریقوں سے واقف ہو جائیں گے جن میں اشارے اور جانداروں کی آوازیں بھی شامل ہیں۔
- زبان کی تہذیبی قدر اور انسانی زندگی میں اس کی ضرورت اور اہمیت سے واقف ہو جائیں گے۔
- بولی اور زبان کے فرق کو واضح کر سکیں گے۔
- دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کے مختلف خاندانوں کے نام سے واقف ہو جائیں گے۔
- ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کے بڑے خاندان یعنی ہند آریائی زبانوں کی ارتقائی تاریخ کو جان لیں گے۔
- اردو کا جن زبانوں سے قریبی رشتہ ہے، ان سے واقفیت حاصل کر لیں گے۔
- اردو زبان کے ابتدائی مرحلے اور نقطۂ آغاز کی نشان دہی کر سکیں گے۔
- مختلف پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کو جان لیں گے۔

1.1 تمہید:

زبان کی ایجاد انسان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ زبانوں کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی روئے زمین پر انسانوں کے وجود کی تاریخ۔ انسانی گروہ نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے آوازیں نکالیں۔ پھر ان آوازوں پر اس گروہ کے دوسرے افراد کے اتفاق اور سمجھوتے سے وہ آوازیں معنویت اختیار کرتی گئیں۔ اس طرح مختلف انسانی گروہوں نے مختلف آوازی نظاموں کو اظہار کا وسیلہ بنا کر الگ الگ زبانوں کی بنیاد ڈالی۔ زبانوں کا ارتقائی سفر آج بھی جاری ہے۔

اس اکائی میں ہم زبان کی ابتدا پر غور کرتے ہوئے اس کے ارتقا کے مختلف مرحلوں سے واقفیت حاصل کریں گے۔ انسانی آبادی کے پھیلاؤ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ زبانوں کی کثرت اور پھیلاؤ کی نوعیت کو سمجھیں گے۔ زبانوں کے مطالعہ کے لیے علم لسانیات کے ماہرین نے دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کو کس طرح خاندانوں اور گروہوں میں بانٹا ہے، یہ جانیں گے۔ ہند آریائی خاندان کے تاریخی پس منظر اور اس کے ارتقا کی کیفیت کو سمجھیں گے۔ ساتھ ہی مغربی ہندی کی بولیوں میں اردو کی ابتدائی شکل کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔

طلبہ کی سہولت کے لیے مشکل الفاظ کے معانی اور امتحانی سوالوں کے نمونے بھی دیے جا رہے ہیں تاکہ طلبہ اس اکائی کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور ممکنہ سوالات سے باخبر رہیں۔

1.2 زبان کی تعریف:

زبان اظہار کا ذریعہ ہے۔ خدا نے انسان کو احساسات اور جذبات عطا کیے ہیں، غور وفکر کی صلاحیت دی ہے۔ انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے، جن جذبات سے دوچار ہوتا ہے اور جو کچھ سوچتا ہے، اس کا اظہار جس وسیلے سے کرتا ہے، اسی وسیلے کو ہم زبان کہتے ہیں۔ اظہار کے اس وسیلے کی بنیاد آوازوں پر قائم ہے۔ اسی لیے زبان کو خود اختیاری صوتی علامتوں کا نظام بھی کہا گیا ہے۔ خود اختیاری سے مراد یہ ہے کہ ایک لسانی گروہ چیزوں، حالتوں اور کیفیتوں کے اظہار کے لیے اپنی سہولت کے مطابق کچھ آوازیں مقرر کر لیتا ہے اور ان آوازوں پر اس لسانی گروہ کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ صوتی علامت سے مراد یہ ہے کہ ایک لسانی گروہ کسی معنی یا مفہوم کے اظہار کے لیے جو آواز یا لفظ مقرر کر لیتا ہے وہ اس معنی و مفہوم کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی معنی یا مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے الگ الگ زبانوں میں الگ الگ الفاظ یا علامتیں پائی جاتی ہیں۔

1.2.1 اظہار کی مختلف صورتیں:

جسمانی اشاروں کے ذریعے بھی اظہار خیال کیا جاتا ہے، مثلاً ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کرنا، ہاتھ کے اشارے یا آنکھوں کے اشارے۔ فجائی اظہار بھی اشاروں کی طرح کسی خاص مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی وہ آوازیں جو خوشی یا غم کی شدت سے بے اختیار نکلتی ہیں جیسے آہ، واہ وغیرہ۔ اسی طرح مختلف تصاویر یا نشانات کے ذریعہ اطلاع یا انتباہ کرنا، مثلاً ٹریفک کے نشانات یا خطرے کی علامتیں۔ انسانی اشاروں اور تصویری علامتوں کے علاوہ جاندار بھی آوازیں نکال کر اظہار کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ تمام آوازیں اور علامتیں زبان کے دائرے میں نہیں آتیں۔ یہ وقتی، عارضی اور ناقص ذریعۂ اظہار ہیں۔

1.2.2 زبان کے خواص:

زبان آوازوں کا ایک ایسا مستقل نظام ہے جسے ایک لسانی اور سماجی گروہ اپنی تمام تر ضروریات کی تکمیل کے لیے کام میں لاتا ہے۔ زبان کی اکائی لفظ نہیں بلکہ جملہ ہے، کیوں کہ زبان میں مفرد آوازوں سے اظہار خیال نہیں ہوتا، بلکہ آوازوں کو جوڑ کر ان کے سلسلے سے مفہوم ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ علم لسانیات میں تحریری زبان کے مقابلے میں تکلمی زبان اصلی اور حقیقی زبان مانی جاتی ہے۔ زبان صرف اظہار کا کام نہیں کرتی بلکہ سننے والوں کے جذبات و احساسات اور خیالات کو بیدار بھی کرتی ہے۔ چنانچہ زبان وہ صوتی اور تکلمی علامت ہے جو سنائی دے، جس کا اظہار شعوری و ارادی طور پر کیا گیا ہو اور جس میں ترسیلی قوت بھی ہو۔ یہ موروثی نہیں ہوتی بلکہ سیکھی جاتی ہے۔ یہ عطیہ خداوندی بھی نہیں بلکہ ماحول کی دین ہے۔

1.2.3 زبانیں کیسے بنیں؟:

دنیا کی کوئی زبان عطیۂ قدرت یا آسمانی نہیں بلکہ انسانی سماج کی پیداوار ہے۔قدرت نے انسان کو آلات نطق اور آوازیں دی تھیں۔انسان نے کائنات میں آنے کے بعد اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ان آوازوں سے کام لیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں انسان نے جسمانی اشاروں سے تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔ پھر جانداروں کی آوازوں کی نقل کی ہوگی اور پھر اپنی آوازوں کو اشیا اور جذبات واحساسات کی علامت کے طور پر استعمال کر کے ان میں معنویت پیدا کر لی ہوگی۔ یہ کام الگ الگ انسانی گروہ نے الگ الگ مقام پر کیا ہوگا۔اس طرح دنیا میں بہت ساری زبانیں وجود میں آئی ہوں گی۔کائنات میں موجود اشیا اور انسان کے جذبات واحساسات اور خیالات پہلے سے موجود تھے۔انھیں نام دینا یا پہچان عطا کرنا آوازوں کے ذریعہ ممکن ہوا۔یہ کام انسان نے کیا۔اس طرح انسان حیوان ناطق قرار پایا اور زبان کی تخلیق اس کی سب سے پہلی اور بڑی ایجاد ثابت ہوئی۔

1.3 زبان کی اہمیت:

انسان ایک سماجی ذی روح ہے۔اس لیے ہوا، پانی اور غذا کے بعد اظہار وترسیل بھی اس کی ایک اہم ضرورت ہے۔ پتھر کے دَور سے آج کے خلائی سفر کے دَور تک انسانی قافلے کی تمام ترقیاں زبان کی مرہونِ منت ہیں۔انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جہاں زبان کی ضرورت نہ ہو۔عبدالغفار شکیل نے لکھا ہے کہ انسانی زندگی میں زبان کا عمل دخل اتنا ہے جتنا چلنا پھرنا یا سانس لینا۔ان کے بقول: ''روزمرہ کی ضروریات، آپس کا لین دین، سماجی رشتے ناطے، مذہبی فرائض، سیاسی گتھیاں، معاشی مسائل، ادبی کارنامے، قانونی معاملات سب کے لیے زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔''

زبان کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔زبانیں نہ ہوتیں تو آج کائنات کی یہ شکل نہ ہوتی۔انسان اور پتھر میں بہت کم فرق ہوتا۔انسان کے یہ سماجی رشتے قائم نہیں ہوتے، یہ تیز رفتار ترقی نہ ہوتی اور انسان کی دنیا بھی جانوروں کی طرح محدود ہوتی۔زبان اور قوت گویائی کے سبب ہی انسان دوسری تمام مخلوقات سے برتر اور افضل ہے۔تہذیب وتمدن کا ارتقا علم وفن کی ترقی سے ہوا اور علوم وفنون کی ترقی زبان کے بغیر ممکن نہیں تھی۔انسان کی تمام مادی اور روحانی ترقی میں زبان کی کارفرمائی ہے۔عتیق احمد صدیقی نے زبان کی اس ہمہ جہتی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''زندہ رہنے کے لیے خواہ نہ سہی، لیکن سماجی اور انسانی زندگی کے لیے زبان لازمی ہے۔اس کے بغیر تہذیب کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔تمام علوم کی بنیاد زبان پر ہی ہے۔انسانی تخیل کے لیے زبان ناگزیر ہے۔''

1.4 بولی اور زبان کا فرق:

زبان تغیر پذیر ہے، یعنی کوئی زبان بہت دنوں تک ایک حالت میں نہیں رہ سکتی۔تبدیلیاں قبول کیے بغیر کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔وقت گزرنے اور علاقے کے پھیلنے سے ایک ہی علاقے کی زبان میں معمولی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

کہاوت ہے کہ کوس کوس پر پانی بدلے، چار کوس پر وانی۔ چنانچہ جس زبان کا علاقہ جتنا بڑا اور پھیلا ہوا ہوگا، اس میں اسی قدر تغیر وتبدل کا عمل ہوگا۔ گیان چند کے الفاظ میں:

''زبان کا علاقہ جتنا بڑا ہوگا اس میں اتنی ہی زیادہ بولیاں ہوں گی۔ یہ علاقہ اگر دشوار گزار ہوگا، یعنی اس کے باشندے ایک دوسرے سے کم مل جل پاتے ہوں گے تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بولیوں کا فرق ہوتا جائے گا۔''

یہ تغیر وتبدل وقت گزرنے، علاقہ کے پھیلنے اور مقامی خصوصیات کے سبب واقع ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ تبدیلی محسوس بھی نہیں ہوتی لیکن رفتہ رفتہ یہ فرق ایک علاقے کی زبان کے مختلف رویوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایک ہی زبان کے ان مختلف روپوں کو اس زبان کی ذیلی شاخ یا بولیاں کہتے ہیں۔ اس طرح ایک زبان کئی بولیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

مرور ایام کے ساتھ ایک زبان کی بولیوں میں سے کوئی بولی مرکزی حیثیت اور اہمیت اختیار کر لیتی ہے جسے معیاری بولی، ترقی یافتہ بولی یا زبان کہتے ہیں۔ معیاری بولی یا زبان اس علاقے کی بولیوں میں مشترک اظہار کا وسیلہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ہندی کی بولیوں میں کبھی برج بھاشا کو یہ حیثیت حاصل رہی، لیکن آگے چل کر اس کی جگہ کھڑی بولی نے لے لی۔ اسی طرح اودھی کی یہ حیثیت ہندی کو حاصل ہوگئی ہے اور اودھی محض بولی رہ گئی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی معیاری بولی یا زبان کئی اسباب سے محض بولی بن کر رہ جاتی ہے اور کوئی بولی معیاری شکل اختیار کر کے زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس رجحان کو اتحاد سے انتشار اور انتشار سے اتحاد کا رجحان قرار دیا جا سکتا ہے۔

1.5 عالمی خاندان السنہ:

انسانوں کی طرح زبانوں کی بھی نسلیں اور خاندان ہیں۔ دنیا میں جو بے شمار بولیاں اور زبانیں ہیں وہ سب ایک ہی نسل یا خاندان سے نہیں ہیں۔ ماہرین لسانیات نے ان زبانوں کی صوتی اور قواعدی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی آپسی نزدیکی یا دوری کو سمجھا ہے۔ الگ الگ نسل اور خاندان کی زبانوں کی گروہ بندی کر کے انھیں نام دیے ہیں۔ یہ گروہ بندی عالمی خاندان السنہ کہلاتی ہے۔ ماہرین نے دنیا کی زبانوں کو مندرجہ ذیل آٹھ بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سامی ۲۔ ہندی چینی ۳۔ دراوڑی ۴۔ منڈا

۵۔ بانتو ۶۔ امریکی ۷۔ ملایا ۸۔ ہندیورپی

ان میں ہندیورپی خاندان سب سے اہم ہے کیوں کہ اس خاندان کی زبانیں نہایت وسیع اور بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یورپ کی بہت سی بڑی زبانیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندایرانی اور ہندآریائی بھی اسی کی شاخیں ہیں۔ ہندایرانی کی اہم زبانیں فارسی، پشتو، پشاچہ وغیرہ ہیں جب کہ ہند آریائی کی شاخ درشاخ ہندوپاک میں پھیلی ہوئی ہے۔

1.6 ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اوران کی زبان:

ہندوستان میں بسنے والی قدیم ترین قوموں میں آسٹرک اور دراوڑی قوموں کا سراغ ملتا ہے۔ عہد قدیم میں ہندوستان کی بڑی آبادی دراوڑ خاندان کی زبانیں بولتی تھی۔ دراوڑ قوم کے بعد یہاں آریائی قوم آئی۔ آریاؤں نے دراوڑوں کو جنوبی ہندوستان کی پہاڑیوں میں ڈھکیل دیا اور خود سندھ و پنجاب کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ آریائی قبائل مختلف اوقات اور مختلف گروہوں میں ہندوستان آئے۔ ان کا اصلی وطن وسط ایشیا کا علاقہ تھا۔ ہندوستان میں ان کی آمد ۱۵۰۰ق م سے پہلے ہو چکی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے انھوں نے مشرقی ایران اور افغانستان میں قیام کیا تھا۔

آریاؤں کے داخلہ ہند سے ہند آریائی زبانوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ان کی زبان جو ایران اور افغانستان کی زبانوں کا اثر لیے ہوئے تھی، یہاں کی دراوڑی زبانوں سے متاثر ہو کر سنسکرت کی شکل میں اپنی پہچان بناتی ہے۔ پہلے آنے والے اور بعد میں آنے والے آریاؤں کی زبان میں مشابہت کے باوجود مرور ایام اور علاقے کے پھیلاؤ کے سبب بہت کچھ فرق بھی تھا۔ اس فرق کو ابتدائی دور کی ویدک سنسکرت اور بعد کے دور کی کلاسیکل سنسکرت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

1.7 ہند آریائی کے ارتقائی مراحل:

ہند یورپی خاندان کی ہند آریائی شاخ میں وہ زبانیں شامل ہیں جو ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد رائج ہوئیں۔ ہند آریائی کا دور ۱۵۰۰ق م سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور میں سنسکرت، پھر پراکرت، پھر اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی دور سے گزر کر آج کی زبانوں تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کا مطالعہ قدیم ہند آریائی، وسطی یا درمیانی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی دور کے تحت کیا جاتا ہے۔

1.7.1 قدیم ہند آریائی دَور:

ہندوستان میں آریائی زبانوں کا یہ دور ۱۵۰۰ق م سے ۵۰۰ ق م تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ سنسکرت زبانوں کا دور ہے۔ اس دور میں آریائی قبائل ہندوستان کے بڑے حصوں میں پھیل چکے تھے۔ لہٰذا ان کی زبانیں، جن کی معیاری شکل سنسکرت تھی، الگ الگ علاقوں میں الگ الگ روپ لیے نظر آتی ہیں۔ سنسکرت کی ان شکلوں کو (۱) اُدیچیہ، یعنی شمال مغربی ہندوستان کی زبان، (۲) مدھیہ دیشیہ، یعنی انبالہ سے الٰہ آباد تک کی زبان اور (۳) پراچیہ، یعنی مشرقی ہندوستان کی زبان کا نام دیا گیا ہے۔

چار وید اور اپنشد سنسکرت میں لکھے گئے ہیں۔ ویدک سنسکرت، ادبی سنسکرت کے مقابلے میں آسان تھی۔ آگے چل کر سنسکرت کتابی اور قواعدی زبان بن گئی۔ عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کے سبب اس کا رواج کم ہونے لگا اور یہ 'دیوبانی' بن کر رہ گئی۔

1.7.2 وسطی ہند آریائی دَور:

سنسکرت کا عوام سے رشتہ ٹوٹنے کے نتیجے میں جو بولیاں رائج ہوئیں وہ پراکرت کہلائیں۔ سنسکرت کے معنی مہذب کے ہیں جب کہ پراکرت، فطری کو کہتے ہیں۔ یہ علاقائی بولیاں تھیں جن کے الگ الگ علاقوں میں الگ الگ روپ تھے۔ پراکرتوں کا دور ۵۰۰ ق م سے ۵۰۰ عیسوی تک کا ہے۔ ان کے رواج میں بدھ اور جین مذہبوں کا بڑا ہاتھ رہا۔ مہاتما بدھ اور مہابیر سوامی نے مذہبی اشاعت کے لیے پراکرتوں کا استعمال کیا۔ راجا اشوک نے بھی اپنے فرمان اسی زبان میں پتھروں اور لاٹوں پر کندہ کرائے۔ پراکرتوں کے دور میں پالی ایک معیاری بولی تھی۔ پراکرتوں کی مختلف شکلیں درج ذیل ہیں:

مہاراشٹری:

پراکرتوں کے دور میں مہاراشٹری پراکرت کو ادبی حیثیت حاصل تھی۔ یہ شاعری اور موسیقی کی زبان تھی۔ سنسکرت ڈراموں میں جو گیت ہیں، ان میں اسی زبان کا استعمال ہوا ہے۔ اس میں جینیوں نے مذہبی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس کے علاقہ کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ یہ موجودہ مہاراشٹر کی زبان تھی۔ دوسری رائے کے مطابق یہ شورسینی پراکرت کی شاخ تھی جو شمال سے جنوب پہنچی۔ مہاراشٹری کو 'مہاراشٹر' یعنی بڑے ملک یا پورے ملک کی زبان بھی کہا گیا ہے۔

شورسینی:

دوآبہ گنگ وجمن کا علاقہ مدھیہ دیش کہلاتا تھا اور مدھیہ دیش کے درمیانی علاقے کو شورسینی دیش کہا جاتا تھا۔ یہ متھرا کا علاقہ ہے۔ علاقے کی مناسبت سے یہاں کی پراکرت کو شورسینی کہا گیا۔ سنسکرت کا مرکزی علاقہ بھی دوآبہ گنگ و جمن کا یہی حصہ تھا۔ اس لیے شورسینی پراکرت سنسکرت کی حقیقی جانشیں اور اس سے قریبی رشتہ رکھنے والی پراکرت رہی۔ اشوگھوش کے سنسکرت ناٹکوں میں اس کی قدیم شکل کے نمونے ملتے ہیں۔ دگامبر جینیوں کی مذہبی کتابیں بھی اس میں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے شورسینی کی دو بولیوں ابھیری/ اہیری اور اونتی کا ذکر کیا ہے۔ مسعود حسین خاں کے مطابق پہلی صدی عیسوی سے ہی اس پراکرت کو مسلم ادبی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔

ماگدھی:

ماگدھی پراکرت مشرقی ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ اس کا مرکز مگدھ دیس یعنی جنوبی بہار تھا۔ آریاؤں کے مرکزی علاقے سے دور ہونے کی وجہ سے ماگدھی پر غیر آریائی بولیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ آریا اسے حقارت سے دیکھتے تھے اور غیر مہذب و ناشائستہ زبان سمجھتے تھے۔ سنسکرت ڈراموں میں ماگدھی کا استعمال نچلے طبقے کے کرداروں کے مکالموں میں ہوا ہے۔

اردھ ماگدھی:

شورسینی اور ماگدھی کے درمیانی علاقے کی پراکرت کواردھ ماگدھی کہا گیا ہے۔ یہ اودھ اور مشرقی اتر پردیش کا علاقہ ہے جسے پورب بھی کہا گیا ہے۔ سنسکرت کے دور میں پورے مشرقی ہندوستان کی زبان پراچیہ کہلاتی تھی۔ اس لحاظ سے ماگدھی اور اردھ ماگدھی کو ایک ہی علاقے کی زبان ماننا چاہیے، لیکن مسعود حسین خاں اور گیان چند جین دونوں کو الگ الگ پراکرت قرار دیتے ہیں۔ اس پراکرت کا استعمال بدھ مت اور جین مت کے علم برداروں کے یہاں ملتا ہے۔ اس میں نظم و نثر کے نمونے دستیاب ہیں۔

پشاچی:

پشاچی پراکرت کشمیر اور پنجاب کے کچھ حصوں میں رائج تھی۔ سنسکرت میں پشاچ کچا گوشت کھانے والے یا بھوت کو کہتے ہیں۔ مہابھارت میں پشاچ قوم کا ذکر ہے۔ اسے بھوتوں کی زبان بھی کہا گیا ہے۔ ماہرین پشاچی کو ہند آریائی سے زیادہ ہند ایرانی سے قریب مانتے ہیں۔ گریرسن کے مطابق یہ سنسکرت دور کی ایک بولی تھی جس کا ارتقا نہیں ہو پایا۔ اسی لیے گریرسن اسے سنسکرت کی بیٹی نہیں، بہن قرار دیتے ہیں، جب کہ پراکرت دور کے قواعد نویس ورروچی، پشاچی کو پراکرت مانتے ہیں۔ ہندوستان کی دیگر آریائی زبانوں کے مقابلے میں پشاچی پست اور حقیر سمجھی جاتی تھی۔

1.7.3 اپ بھرنش دور:

سنسکرت کی طرح پراکرتیں بھی جب ادبی حیثیت حاصل کر کے عوام سے دور ہوتی گئیں تو عوام میں جن ٹوٹی پھوٹی بولیوں کا چلن ہوا انھیں اپ بھرنش کہا گیا۔ اپ بھرنش کے معنی ہیں بھرشٹ، بگڑی ہوئی یا ٹوٹی پھوٹی۔ جس طرح پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ ایک دور کی زبان کا نام ہے، اسی طرح اپ بھرنش بھی ایک دور کی زبان کا مجموعی نام ہے۔ وسطی ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کا آخری دور ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک اپ بھرنشوں کا دور رہا۔ اپ بھرنشوں میں تت سم کے بہ مقابلہ تد بھو الفاظ زیادہ ہیں۔ دیسی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی اور ترکی کے کچھ الفاظ بھی بگڑی ہوئی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اپ بھرنشوں کے دور میں زبانوں کا پھیلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ ایک پراکرت کے علاقے میں ایک سے زیادہ اپ بھرنشیں نظر آتی ہیں۔ دسویں صدی کے بعد کی جدید ہند آریائی زبانیں اپ بھرنشوں سے ہی ابھری ہیں۔

1.7.4 جدید ہند آریائی دور:

ہندوستان میں بولی جانے والی غیر آریائی زبانوں کو چھوڑ کر موجودہ دور میں زبانوں کا جو جال پھیلا ہوا ہے، اس کا سلسلہ جدید ہند آریائی دور سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۰۰۰ء کے بعد اپ بھرنشوں کی گود سے جدید ہند آریائی زبانیں سر اُٹھانے لگتی ہیں اور تیرہویں سے چودھویں صدی تک اپنی پہچان بنا لیتی ہیں۔ مختلف جدید ہند آریائی زبانوں، ان کے علاقوں اور

اپ بھرنشوں سے ان کے رشتوں کو مندرجہ ذیل خاکے سے سمجھا جا سکتا ہے:

علاقہ	اپ بھرنش	جدید ہند آریائی زبانیں
وسطی یا درمیانی	شورسینی اپ بھرنش	مغربی ہندی کی بولیاں یعنی کھڑی، برج، ہریانی، قنوجی اور بندیلی
جنوب مغربی	ناگراپ بھرنش	گجراتی
	اُپ ناگراپ بھرنش	راجستھان کی بولیاں یعنی میواتی، مارواڑی، جے پوری اور نیماڑی وغیرہ
مشرقی	ماگدھی اپ بھرنش	بہاری کی بولیاں یعنی مگہی، بھوجپوری، میتھلی، بنگالی، اسامی اور اڑیا
	اردھ ماگدھی اپ بھرنش	مشرقی ہند کی بولیاں یعنی اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی
شمال مغربی	پراچڈاپ بھرنش	سندھی، وچولی، سریکی وغیرہ
	کیکئی اپ بھرنش	پنجابی، لہندا
شمالی	کھس اپ بھرنش	پہاڑی بولیاں یعنی نیپالی یا گورکھالی، کمایونی اور گڑھوالی وغیرہ
جنوبی	مہاراشٹری اپ بھرنش	مراٹھی، براری، کونکنی اور سنہالی وغیرہ

1.7.5 تہذیبی اختلاط:

اپ بھرنشوں کے آخری دور میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے جو تہذیبی لین دین شروع ہوا، اس کا یہاں کی زبانوں پر خوش گوار اثر پڑا۔ عربی، فارسی اور ترکی کا اثر قبول کر کے اس دور کی زبانیں اپنا رنگ بدلنے لگیں اور جدید ہند آریائی زبانوں کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ میں حکومت قائم کی جو تقریباً تین سو سال تک قائم رہی۔ سندھ میں بڑی تعداد میں عربی بولنے والے مسلم آباد ہوئے۔ ان کا قافلہ سندھ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس واقعہ نے سندھ کی تہذیب اور زبان کو متاثر کیا۔ اس زمانے میں سندھ میں بولی جانے والی زبان عربی سے متاثر ہوئی۔ آج کی سندھی میں بھی عربی الفاظ کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ سندھ کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کی آمد ہوئی۔ غزنوی بادشاہوں نے پنجاب میں حکومت قائم کی جس کے نتیجے میں ترکی کے علاوہ فارسی بولنے والوں کی بڑی آبادی پنجاب میں پھیل گئی۔ پنجاب میں مسلم سلطنت تقریباً دو سو سال تک قائم رہی۔ اس عہد میں مسلمانوں کے اہل پنجاب سے مضبوط

سماجی وتہذیبی رشتے قائم ہوئے اور پنجاب کی زبان نے عربی وفارسی اور ترکی سے خون گرم حاصل کیا۔

پنجاب کے بعد مسلم حکمرانوں نے ۱۱۹۳ء میں دلّی کو فتح کر کے اپنا پایہ تخت بنایا۔ دلّی ایک کثیر لسانی علاقہ تھا۔ دلّی اور اس کے اطراف میں شورسینی اپ بھرنش سے تعلق رکھنے والی مختلف بولیاں رائج تھیں۔ دلّی اور مغربی اتر پردیش میں کھڑی بولی، دلّی سے متصل ہریانہ کے علاقے میں ہریانی (بانگڑو)، جمنا پار متھرا اور آگرہ کے علاقوں میں برج اور راجستھان سے ملنے والے سرحدی علاقوں میں میواتی کا چلن تھا۔ ابھی ان زبانوں نے اپنی پہچان نہیں بنائی تھی اور چوں کہ ناپختہ حالت میں تھیں، اس لیے مسلمانوں کی آمد سے یہ زبانیں تیزی سے اپنا رنگ روپ بدلنے لگیں۔ اس تہذیبی اختلاط نے ان زبانوں کو عربی، فارسی اور ترکی کا خون تازہ عطا کیا اور ان کی انفرادی شناخت قائم ہونے لگی۔ مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا اتنی تیزی سے نہ ہوتا۔

دلّی اور اس کے اطراف کی یہ بولیاں، خاص کر کھڑی بولی مسلم حکمرانوں اور صوفیوں کے ذریعہ ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچی۔ چودھویں صدی میں علاء الدین خلجی کے فتح دکن اور محمد بن تغلق کے پایہ تخت بدلنے کے ساتھ دلّی کی بڑی آبادی دکن تک اس زبان کو لے آئی۔ شمالی ہند سے جانے والی اس زبان نے مراٹھی اور گجراتی کے ساتھ جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں کو متاثر بھی کیا اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔ ہندوستان کو اپنا گھر بنانے والے مسلم فاتحین، ان کی نسلوں اور صوفیا نے یہاں کے مقامی لوگوں کے میل سے جس مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالی، اردو اسی گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار ہے۔

1.8 اردو کی خاندانی تشکیل:

اردو مخلوط یا کھچڑی زبان نہیں۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں کے ہندوؤں کی زبانوں کے میل سے اردو پیدا ہوئی، یہ خیال سراسر غلط ہے۔ زبانیں ایسے نہیں بنتیں۔ انسانوں کی طرح زبانوں کی بھی نسل اور خاندان ہوتے ہیں۔ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کا خاندانی سلسلہ شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے ہوتے ہوئے سنسکرت سے جاملتا ہے۔ ۱۰۰۰ء کے بعد شورسینی اپ بھرنش کے علاقے میں جو بولیاں ابھریں انھیں مغربی ہندی کا نام دیا گیا۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں کھڑی بولی، ہریانی، برج، قنوجی اور بندیلی شامل ہے۔ مسلم تہذیب کے اثر سے یہ بولیاں تیزی سے اپنا روپ بدلنے لگیں۔ یہ اثر کھڑی بولی نے سب سے زیادہ قبول کیا اور نکھر سنور کر ہندی، ہندوی، ہندوستانی، دہلوی، ریختہ اور اردوے معلّٰی کہلاتے ہوئے اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ اردو کی اصل کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی کی اس ترقی یافتہ شکل کے ابتدائی نمونے امیر خسرو کے ہندوی کلام اور صوفیا کے اقوال میں ملتے ہیں۔ اس طرح بقول گیان چند جین اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ اوّل کھڑی بولی کا آغاز، دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول، جس کا نام اردو ہو جاتا ہے۔

1.9 غیر ہند آریائی زبانیں:

ہندو پاک کے بڑے علاقے میں ہندآریائی زبانوں کا چلن ہے۔ کچھ علاقوں میں ہندایرانی شاخ کی زبانیں مثلاً پشتو اور بلوچی وغیرہ بھی رائج ہیں۔ کچھ زبانیں غیرآریائی ہیں جن میں منڈا خاندان کی قبائلی زبانیں سنتھالی، منڈا، ہو وغیرہ ہیں۔ ان کے بولنے والے مغربی بنگال میں گنگا کے قریبی علاقوں، چھوٹا ناگپور کے پٹھاری علاقوں اور مدراس کے کچھ علاقوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے چار بڑے صوبوں میں بھی غیرآریائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تمل ناڈو میں تمل، کیرل میں ملیالم، کرناٹک میں کنڑ اور آندھراپردیش میں تلنگی یا تیلگو دراوڑی خاندان کی زبانیں ہیں۔

1.10 خلاصہ:

زبان انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسانی معاشرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مافی الضمیر کے اظہار کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ زبان خود اختیاری صوتی علامتوں کا ایک نظام ہے جسے ابتدا میں ایک چھوٹے سے لسانی گروہ نے پروان چڑھایا۔ تمدنی ارتقا کے ساتھ اس کا دائرہ پھیلتا گیا اور اس میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ یہ اختلافات ایک علاقے کی زبان میں وقت گزرنے اور علاقے کے پھیلاؤ سے پیدا ہوئے جن سے نئی نئی زبانیں وجود میں آئیں۔ دنیا بھر میں بولی جانے والی بے شمار زبانوں کی نسلی اور خاندانی تقسیم کرکے ماہرین لسانیات نے زبانوں کی تاریخ کو مرتب کیا ہے۔

اس اکائی میں ہم نے زبان کی تعریف، ان کی پیدائش کا عمل، بولی اور زبان کا فرق اور زبان کی ضرورت واہمیت کے بارے میں جانا۔ دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی گروہ بندی سے واقف ہوئے۔ یہ جانا کہ ہندوستان میں آریائی قوم جو زبان لائی وہ یہاں کی فضا میں پروان چڑھ کے سنسکرت کے نام سے رائج ہوئی۔ سنسکرت میں وید لکھے گئے۔ سنسکرت جب کتابی زبان بن گئی تو اس کی بدلی ہوئی اور آسان شکل عوام میں مقبول ہوئی جسے پراکرت کہا گیا۔ بدھ اور جین مت کے ماننے والوں نے پراکرتوں میں مذہبی پیغامات کو عام کیا۔ پراکرتوں میں پالی کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ پراکرتوں کا ابی شکل اختیار کرکے عوامی دھارے سے کٹ جانا اور پراکرتوں کی جگہ اپ بھرنشوں کا رائج ہونا ہندآریائی زبانوں کے ارتقا کا دوسرا دور تھا۔ اس اکائی میں ہم مختلف پراکرتوں اور مختلف اپ بھرنشوں سے واقف ہوئے۔ اپ بھرنشوں کے بعد ابھرنے والی جدید ہندآریائی زبانوں کے نام اور ان کے علاقوں کو جانا۔ ۱۰۰۰ء کے بعد ہندوستان میں مسلم فاتحین کے پنجاب اور دلّی میں حکومت قائم کرنے کے نتیجے میں جو تہذیبی اختلاط ہوا، اس کا ہندوستانی زبانوں پر کیا اثر پڑا، اس کو سمجھا۔ ساتھ ہی ہندوستان میں رائج دوسرے خاندانوں کی زبانوں سے بھی واقف ہوئے۔

1.11 مشکل الفاظ کے معنی:

لفظ	معنی

اختلاط	میل جول
ارتقا	ترقی کرنا، آگے بڑھنا
اشاعت	پھیلانا
اشیا	چیزیں
آلاتِ نطق	انسانی جسم کے وہ حصے جن کی مدد سے آوازیں نکلتی ہیں۔
انتشار	بکھراؤ
انتباہ	متنبہ کرنا، خبردار کرنا
تت سم	سنسکرت کے اصلی الفاظ
تخلیق	پیدا کرنا
تدبھو	سنسکرت کے ایسے الفاظ جن میں توڑ مروڑ ہوئی ہو اور ان کی اصلی شکل بدل گئی ہو۔
ترسیل	پہنچانا
تشکیل	شکل پانا، بننا
تغیر و تبدل	تبدیلی، بدلاؤ
تکلمی زبان	بول چال کی زبان
جانشیں	جگہ لینے والا
جنوب	دکھن
لفظ	**معنی**
حیوان ناطق	انسان، بات چیت کرنے والا حیوان
دارالسلطنت	راجدھانی
شمال	اتر
صوت	آواز
عالمی خاندان السنہ	دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں کے خاندان
علامت	نشان، پہچان
عہدِ قدیم	پرانا دور
فجائی اظہار	وہ آوازیں جو خوشی یا غم کی شدت سے بے اختیار نکلتی ہیں۔

قیام	ٹھہراؤ
کثیر لسانی	ایک سے زیادہ زبانوں کا علاقہ
مادی	جسمانی
مرورِ ایام	وقت کا گزرنا
مرہونِ منت	احسان مند
مشترک	ساجھا
معاشی	روزگار سے متعلق
مافی الضمیر	جو باتیں انسان کے ذہن و دل میں ہوتی ہیں۔
منتقلی	جگہ بدلنا
ماہرین لسانیات	علم زبان یا علم لسان کے ماہر
ناگزیر	ضروری
نقطۂ آغاز	شروع ہونے کا مقام، شروعات
وسط	بیچ
وسیلہ	ذریعہ
ہمہ جہتی	بہت سی جہتیں یا پہلو، ہر طرف

1.12 نمونۂ امتحانی سوالات:

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب ۵۰ سے ۱۰۰، الفاظ میں دیجیے:

۱۔ زبان کی تعریف کیجیے۔

۲۔ اظہار کی مختلف صورتوں پر روشنی ڈالیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب ۱۵۰ سے ۳۰۰، الفاظ میں دیجیے:

۳۔ بولی اور زبان کے فرق کو واضح کیجیے۔

۴۔ انسانی زندگی میں زبان کی کیا اہمیت ہے؟

مندرجہ ذیل سوال کا جواب ۵۰۰ سے ۸۰۰، الفاظ میں دیجیے:

۵۔ وسطی ہند آریائی بانوں کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

1.13 مزید مطالعہ کے لیے نامزد کتابیں:

۱۔	اردو زبان کی تاریخ	مرتبہ مرزا خلیل بیگ
۲۔	عام لسانیات	گیان چند جین
۳۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی (ترجمہ عتیق احمد صدیقی)
۴۔	زبان اور علم زبان	عبدالقادر سروری
۵۔	ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور
۶۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین
۷۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خاں
۸۔	اردو لسانیات	شوکت سبزواری
۹۔	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی
۱۰۔	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	جمیل جالبی

○○○

اکائی (۲)

اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف نظریات

ساخت:

1.0 اغراض و مقاصد

1.1 تمہید

1.2 اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق ابتدائی دور کے نظریات

1.2.1 ابتدائی دور کے رائے دہندگان

1.2.2 اردو اور برج کا نظریہ

1.2.3 اردو اور پنجابی کا نظریہ

1.2.4 اردو اور سندھی کا نظریہ

1.2.5 ابتدائی دور کے نظریات کا جائزہ

1.3 اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات

1.4 محی الدین قادری زور کا نظریہ

1.4.1 محی الدین قادری زور کے نظریے کا جائزہ

1.5 مسعود حسین خاں کا نظریہ

1.5.1 مسعود حسین خاں کے نظریے کا جائزہ

1.6 شوکت سبزواری کا نظریہ

1.61 شوکت سبزواری کے نظریے کا جائزہ

1.7 سہیل بخاری کا نظریہ

1.8 گیان چند کا نظریہ

1.9 مرزا خلیل احمد بیگ کا نظریہ

1.10 خلاصہ

1.11 مشکل الفاظ کے معنی

1.12 نمونۂ امتحانی سوالات

1.13 مزید مطالعہ کے لیے نام زد کتابیں

☆☆☆

1.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد اردو زبان کی تاریخ سے واقف کرانا ہے۔ اردو زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس سلسلے میں مختلف ماہرین کے نظریات اور ان کے نظریات کا جائزہ اس اکائی میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ مندرجہ ذیل امور سے واقف ہو جائیں گے:

- موجودہ اردو زبان کا ماضی کیا ہے اور اس کی تاریخ ماضی میں کہاں تک پہنچتی ہے۔
- اردو زبان کی پیدائش کا علاقہ کون سا ہے۔
- اردو زبان کا نسلی اور خاندانی رشتہ کس زبان سے ہے اور کس زبان کو اردو کی اصل قرار دیا گیا ہے۔
- اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں کس طرح کی رائیں اور خیالات ونظریات پائے جاتے ہیں؟ رائے دہندگان اور نظریہ ساز کون ہیں؟
- اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے مراحل کس طرح طے ہوئے۔

1.1 تمہید:

اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ خاصا اختلافی ہے۔ اس کے بارے میں کئی طرح کی رائیں اور نظریات موجود ہیں۔ کوئی اردو کا رشتہ پالی سے جوڑتا ہے، کوئی برج سے، کوئی پنجابی سے، کوئی ہریانی سے تو کوئی کھڑی بولی سے۔ اردو کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں رائے دہندوں اور نظریہ سازوں میں ابتدائی دور کے بعض ادیب اور علما شامل ہیں تو بعد کے دور کے ماہرین لسانیات بھی۔ بعض یوروپی مستشرق بھی ہیں۔ کچھ رائیں محض قیاس یا تاریخی حالات کی بنیاد پر دی گئی ہیں تو کچھ لسانی تجزیے اور استدلال پر قائم ہیں۔ اس طرح اردو کی ابتدا وارتقا کے سلسلے میں جو مختلف رائیں اور نظریات ہیں، اس اکائی میں ان کا احاطہ کیا گیا ہے اور بعض اہم نظریات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ طلبہ موضوع کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہو جائیں۔ طلبہ کی سہولت کے لیے سبق کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی اور امتحانی سوالات کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

1.2 اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق ابتدائی دور کے نظریات:

اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں ابتدائی دور کے رائے دہندوں کا خیال ہے کہ مقامی ہندوؤں اور باہر سے آنے والے مسلم حکمرانوں کی زبانوں کے میل سے جو زبان بنی، اسی کا نام اردو ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ باہر سے آنے والے حکمرانوں، تاجروں اور صوفیوں کی زبان عربی، ترکی یا فارسی تھی۔ ان زبانوں کے

بولنے والے ہندوستان کے جس علاقے میں گئے، وہاں کے لوگوں کی زبان سے ان کی زبانوں کا میل ہوا جس سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ ملک کے نام کی مناسب سے اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا اور آگے چل کر یہ اردو کہلائی۔

1.2.1 ابتدائی دور کے رائے دہندگان:

اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں ابتدائی دور کے رائے دہندگان میں میر امن، انشا، سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی، محمد حسین آزاد، امداد امام اثر، شمس اللہ قادری، محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور یورو پی علما میں ہیور نلے، جیولز بلاک، گراہم بیلی اور سر جارج گریرسن کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے بیش تر نے اردو کو مرکب یا مخلوط زبان قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی فارسی/عربی/ترکی اور ہندوستان کی مقامی زبان کے میل سے اردو وجود میں آئی۔ البتہ مسلمانوں کی زبان کا، ہندوستان کی کس زبان سے اور کہاں میل ہوا، اس بارے میں ان کی رائیں الگ الگ ہیں۔ کیوں کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کا یہاں کے ہندوؤں سے کئی علاقوں میں میل ہوا، چنانچہ بعض نے فارسی اور برج کی آمیزش سے اردو کی پیدائش کا نظریہ پیش کیا اور بعض نے فارسی اور پنجابی کی آمیزش کا۔ کسی نے عربی اور سندھی کے اتصال میں اردو کی جڑیں تلاش کیں تو کسی نے دکن کے علاقے میں۔ اس طرح کے بعض اہم نظریات درج ذیل ہیں:

1.2.2 اردو اور برج کا نظریہ:

اردو کی اصل برج بھاشا ہے جو مغلوں کے دور میں فارسی سے متاثر ہو کر اردو بن گئی۔ اس خیال کے حامی میر امن، انشا، سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی، ہیور نلے، محمد حسین آزاد اور شمس اللہ قادری ہیں۔ چوں کہ آگرہ ایک لمبے عرصے تک مسلم حکمرانوں کا پایۂ تخت رہا اور اس علاقے کی زبان یعنی برج بھاشا اس دور میں نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اس لیے مذکورہ علما نے برج بھاشا کو اردو کی اصل قرار دیا۔ اس نظریے کو مقبول عام بنانے کا کام محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں یہ لکھ کر کیا: ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔'' یہی خیال شمس اللہ قادری نے ان الفاظ میں پیش کیا:

> ''مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔''

1.2.3 اردو اور پنجابی کا نظریہ:

گیارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں پنجاب میں غزنوی سلطنت قائم ہوئی۔ غزنوی دور میں باہر سے آنے والے زیادہ تر مسلمان فارسی بولتے تھے، کچھ ترکی بولنے والے بھی تھے۔ یہ پنجاب میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام

تقریباً دوسوسال رہا۔اس دوران دونوں فریق کی زبانوں کے میل سے وجود میں آنے والی زبان اردو رہی ہوگی۔اس مفروضے کی بنیاد پر حافظ محمود خاں شیرانی نے یہ نتیجہ نکالا کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔اپنے اس نظریے کو استدلال فراہم کرنے کے لیے انھوں نے اردو اور پنجابی کی بعض مشترک لسانی خصوصیات کو پیش کیا۔محمود خاں شیرانی کا یہ نظریہ ان کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں تفصیل سے موجود ہے۔

اردو کے پنجابی سے مشتق ہونے کے نظریے کو کئی دوسرے ماہرین لسانیات کی رایوں سے بھی تقویت پہنچی۔مثلاً سنیتی کمار چٹرجی، محی الدین قادری زور، جارج گریرسن اور ٹی.گراہم بیلی۔بیلی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:

> ''اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی سوتیلی ماں۔برج سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو اُن دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا، اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے۔''

1.2.4 اردو اور سندھی کا نظریہ:

اختلاط، یعنی باہر سے آنے والے مسلمانوں اور ہندوستان کے باشندوں کے میل سے اردو بنی، اس خیال کی بنیاد پر سید سلیمان ندوی نے اردو کا رشتہ سندھی سے جوڑا۔اردو کی بنیاد سندھ میں پڑنے کے تعلق سے انھوں نے اپنی کتاب ''نقوش سلیمانی'' میں اظہار خیال کیا ہے۔انھوں نے یہ نظریہ اس لیے قائم کیا کہ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی سربراہی میں عرب مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ہوئی۔یہاں ان کی حکومت قائم ہوئی جو تقریباً تین سو سال تک قائم رہی۔یہ واقعہ آٹھویں صدی سے دسویں صدی عیسوی کے درمیان کا ہے۔چنانچہ سید سلیمان ندوی نے یہ رائے دی کہ:

> ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں۔اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

اسی تسلسل میں مولانا ندوی کے ایک اور بیان کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ ''یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔''

1.2.5 ابتدائی دور کے نظریات کا جائزہ:

اردو زبان کے آغاز اور جاے پیدائش کے سلسلے میں ابتدائی دور کے رائے دہندگان نے جو نظریہ عام کیا، وہ اختلاط کا

نظریہ ہے۔یعنی ہندوستان کے جس علاقے میں مسلمان گئے وہاں پہلے سے بولی جانے والی زبان اورنو وارد مسلمانوں کی زبان کے میل سے اردو زبان وجود میں آئی۔ دوقوموں کی زبانوں کے میل سے ایک نئی زبان کے وجود میں آنے کا نظریہ محض قیاس پر مبنی ہے۔علم لسانیات کی رو سے زبانوں کی پیدائش اس طرح نہیں ہوئی۔اس طرح کی رائے رکھنے والے ادیب اور عالم علم لسانیات سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔

دو زبانوں میں بعض مماثلتوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سے دوسری پیدا ہوئی۔ دخیل الفاظ کی مماثلت دو زبانوں کی صرف قربت ثابت کرتی ہے۔کوئی زبان کس زبان پر مبنی ہے، اس کی پرکھ کے لیے ان کے کچھ بنیادی الفاظ اور صرفی ونحوی ڈھانچے کی مماثلت بنیاد بنتی ہے۔اردو کے برج بھاشا، پنجابی یا سندھی سے ماخوذ ہونے کے دعووں کو لسانی تجزیے کی بنیاد پر ماہرین رد کر چکے ہیں۔ یہ تینوں زبانیں جدید ہند آرائی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا تشخص بھی اردو کی طرح تیرہویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔قدیم اردو پر ان زبانوں کے گہرے اثرات ہیں، لیکن بہن کے رشتے سے، ماں بیٹی کے رشتے سے نہیں۔ یہ اثر اور مماثلت صرف ان تین زبانوں کی حد تک نہیں بلکہ نواح دہلی کی دیگر بولیوں نے بھی اردو پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔جیسا کہ مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ قدیم اردو کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ہریانی پن'' بھی ہے۔

1.3 اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات:

اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے سلسلے میں جس طرح ادیبوں اور عالموں کی رائیں الگ الگ ہیں، اسی طرح ماہرین لسانیات کے درمیان بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ایسے ماہرین میں محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، سہیل بخاری، گیان چند اور مرزا خلیل احمد بیگ کے نام اہم ہیں۔ذیل میں ان ماہرین کے نظریات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

1.4 محی الدین قادری زور کا نظریہ:

محی الدین قادری زور نے اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں اپنا نظریہ ''ہندوستانی لسانیات'' میں پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق اردو اس زبان سے ترقی پا کر بنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔اردو زبان کی بنیاد مسلمانوں کے فتح دہلی ۱۱۹۳ء سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔البتہ اس کی پہچان تب قائم ہوئی جب مسلمانوں نے دہلی کو پایہ تخت بنایا۔زور کا خیال ہے کہ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں موجودہ شمال مغربی سرحدی صوبے سے الٰہ آباد تک ایک ہی زبان رائج تھی۔ بارہویں صدی کے بعد پنجاب میں بولی جانے والی زبان ''پنجابی'' کے طور پر اور دلّی کے

اطراف کی بولی ''کھڑی بولی'' کے طور پر اپنی پہچان بناتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو خیال پیش کیا ہے وہ انھیں کے لفظوں میں اس طرح ہے:

> ''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی، جب تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الٰہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔''

1.4.1 محی الدین قادری زور کے نظریے کا جائزہ:

محی الدین قادری زور نے اردو کے آغاز کا کوئی واضح نظریہ قائم نہیں کیا ہے۔ ان کے مذکورہ بیان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اردو کی بنیاد فتح دہلی یعنی ۱۱۹۳ء سے بہت پہلے پنجاب کے علاقے میں پڑی۔ پایۂ تخت دہلی منتقل ہونے پر یہ زبان خام حالت میں دہلی پہنچی اور وہاں اس کی شناخت قائم ہوئی۔ اگر اس بیان سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو یہ کہ اردو کی جڑیں پنجابی کی قدیم ترین شکل میں پیوست ہیں، جب پنجابی خام حالت میں تھی۔ انھوں نے واضح طور پر یہ نہیں کہا ہے کہ اردو کی اصل پنجابی ہے بلکہ اردو کا ماخذ اس زبان کو قرار دیا ہے جو جدید پنجابی اور کھڑی بولی کا مشترک ماخذ تھی، لیکن وہ زبان کیسی تھی اس کی کوئی تفصیل انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق تھا، محل نظر ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اتنے بڑے علاقے میں ایک ہی زبان کیوں کر بولی جا سکتی ہے۔ علاقائی فرق کا ہونا تو زبان کی فطرت میں داخل ہے اور علم لسانیات کا مسلمہ اصول ہے۔ اس بیان کے لیے انھوں نے کوئی ٹھوس ثبوت بھی فراہم نہیں کیا۔ اگر سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش دور میں بھی اس بڑے علاقے میں مختلف سنسکرتیں، پراکرتیں اور اپ بھرنشیں رائج تھیں تو جدید ہند آریائی دور میں اس علاقے کی زبان ایک کیسے ہو سکتی ہے؟

1.5 مسعود حسین خاں کا نظریہ:

مسعود حسین خاں نے ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' میں اردو کی اساس کسی ایک زبان پر قائم ہونے کا واضح نظریہ پیش نہیں کیا ہے۔ انھوں نے اردو کا مولد نواح دہلی قرار دیا ہے۔ نواح دہلی چار بولیوں کا سنگم ہے۔ ان چار بولیوں میں کھڑی بولی، ہریانی، میواتی اور برج بھاشا شامل ہے۔ مسعود حسین خاں کا نظریہ یہ ہے کہ اردو پر مختلف ادوار میں ان

چاروں بولیوں نے اثر ڈالا۔ان میں سب سے قدیم ہریانی کا اثر ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''قدم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے۔اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں اور جب پندرہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔''

''راجپوتوں کی دلّی..... ہریانے کے علاقے میں تھی جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔''

نواح دہلی کی بولیوں سے متعلق تحریری مواد کے لسانی مطالعے کی بنیاد پر مسعود حسین خاں نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ نواح دہلی کی یہ چاروں بولیاں اردو کا سرچشمہ ہیں اور شہر دلّی مولد ومنشا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے آگے چل کر اپنے ایک مضمون میں اردو کے کھڑی بولی سے ماخوذ ہونے کا نظریہ بھی پیش کیا۔

1.5.1 مسعود حسین خاں کے نظریے کا جائزہ:

مسعود حسین خاں علم لسانیات کے ماہر تھے۔انھوں نے اردو کے پنجابی سے ماخوذ ہونے کے شیرانی کے نظریے کو لسانی تجزیے سے رد کیا ہے۔اس کے باوجود خود انھوں نے اردو کی بنیاد کے سلسلے میں کسی ایک زبان کی نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ نواح دہلی کی چار بولیوں کو اردو کا منبع وسرچشمہ قرار دیا ہے۔اس بحث میں انھوں نے ہریانی کو سرفہرست رکھا ہے جس پر محی الدین قادری زور نے کچھ اس طرح تنقید کی ہے:

''اس مقالے میں اگرچہ زیادہ تر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن جیولز بلاک کے مذکورہ بالا مضمون کو بنیاد قرار دے کر پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانی کو آگے بڑھایا جائے۔''

لسانیات سے گہرے شغف اور قدیم لسانی مواد کے تجزیاتی وتقابلی مطالعے کے باوجود مسعود حسین خاں کا نظریہ اعتراضات کی زد میں رہا اور گیان چند نے ان کے نظریے پر یوں اعتراض کیا: ''ڈاکٹر مسعود حسین کا نظریہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا آغاز ہریانی، کھڑی بولی، میواتی اور برج کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔کیا اردو کے افعال کے کچھ روپ ہریانی سے، کچھ میواتی سے اور کچھ برج سے لیے گئے ہیں؟''

1.6 شوکت سبزواری کا نظریہ:

شوکت سبزواری اردو کے آغاز و ارتقا سے بحث کرتے ہوئے پراکرت دور تک پہنچتے ہیں۔ پہلے انھوں نے اپنی کتاب ''اردو زبان کا ارتقا'' میں اردو کا رشتہ پالی سے جوڑا تھا، بعد میں اپنی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' میں انھوں نے اردو کو کھڑی بولی پر مبنی قرار دیا۔ کھڑی بولی کو انھوں نے ہندوستانی کا نام بھی دیا۔ یہ ہندوستانی یا کھڑی بولی دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے:

> ''اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہل علم عام طور سے برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے، جو اس وقت پڑی کہلاتی تھی، کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور پر وہی رہی جو آج ہے۔ اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔''

شوکت سبزواری نے اردو کے آغاز و ارتقا کی بحث میں زبان کی صرفی و نحوی ساخت پر خاص زور دیا ہے اور اس خیال کو یکسر رد کیا ہے کہ دو یا کئی زبانوں کے میل سے ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ ہر نئی زبان کسی ایک زبان پر قائم ہوتی ہے جس کی شناخت اس کے صرفی و نحوی ڈھانچے سے کی جا سکتی ہے۔ اردو کا صرفی و نحوی ڈھانچہ کھڑی بولی کا ہے اور اردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

شوکت سبزواری نے اردو کا رشتہ کھڑی بولی سے قائم کیا ہے لیکن اس سے آگے کے مرحلے میں وہ شورسینی اپ بھرنش کو درمیان میں نہیں لاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو یا ہندوستانی کا رشتہ اس اپ بھرنش سے ہے جو گیارہویں صدی عیسوی میں مدھیہ دیش میں رائج تھی اور جو بول چال کی اپ بھرنش تھی۔ اسی لیے وہ ''مغربی ہندی'' کے تصور کو رد کرتے ہوئے اسے فرضی اور خیالی قرار دیتے ہیں۔

1.6.1

اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے سلسلے میں شوکت سبزواری نے تفصیل کے ساتھ مدلل بحث کی ہے۔ انہوں نے

دوسرے ماہرین کے نظریات پر بھی گفتگو کی ہے اور لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اردو کے کھڑی بولی پر قائم ہونے کے نظریے کو استدلال اور استحکام بخشا۔آگے چل کر یہ نظریہ مقبول عام ہوا۔ شوکت سبزواری کے نظریے پر جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کہیں وہ اردو، ہندوستانی اور کھڑی بولی کو ایک مانتے ہیں تو کہیں اردو کو ہندوستانی یا کھڑی بولی کی ادبی شکل کہتے ہیں۔ اردو کا ارتقا براہ راست کھڑی بولی سے بھی دکھاتے ہیں اور بول چال کی اپ بھرنش سے بھی۔اسی طرح کبھی وہ قدیم مغربی ہندی کو اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں تو کبھی اس کی تردید کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کے بعض بیانات مبہم اور وضاحت طلب ہیں۔ان کی بعض باتوں میں تضاد نظر آتا ہے۔اردو اور شورسینی اپ بھرنش کے رشتوں پر انھوں نے جو مدلل گفتگو کی ہے،اس میں وزن ہے لیکن جس بول چال کی اپ بھرنش سے اردو کے رشتے ہموار کیے ہیں وہ قیاس پر مبنی ہے اور اس کے لیے انھوں نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔

1.7 سہیل بخاری کا نظریہ:

سہیل بخاری نے شوکت سبزواری کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے اردو کی اصل کھڑی بولی کو قرار دیا ہے۔ وہ اردو اور ہندی کو کھڑی بولی کے دو روپ مانتے ہیں۔ دونوں میں فرق رسم الخط اور دخیل الفاظ کا ہے لیکن صرفی ونحوی ڈھانچہ ایک ہے۔انھوں نے اپنا یہ نظریہ ''اردو کا قدیم ترین ادب'' کے عنوان سے ایک مضمون میں پیش کیا تھا۔آگے چل کر اپنی کتاب ''اردو کے روپ'' میں انھوں نے ایک الگ نظریہ پیش کیا جسے ماہرین لسانیات نے یکسر رد کر دیا۔ان کے نئے نظریے کے مطابق اردو ہند آریائی نہیں بلکہ دراوڑی خاندان کی زبان ہے اور اس کی جاے پیدائش پنجاب،سندھ، دلّی یا دکن نہیں بلکہ اڑیسہ کی سرزمین ہے۔

1.8 گیان چند کا نظریہ:

گیان چند نے اردو کی اصل کھڑی بولی کو قرار دیا ہے۔انھوں نے اردو کے پنجابی، ہریانی، برج یا دکنی وغیرہ کے رشتوں سے متعلق نظریات کو لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں رد کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ زبان کی آپسی مماثلتوں میں تمام مشترک الفاظ اہمیت نہیں رکھتے بلکہ بعض بنیادی الفاظ سے ہی زبانوں میں اختلاف و اشتراک اور رشتوں کا تعین ہوتا ہے۔انھوں نے ایسے بنیادی الفاظ کی ایک فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے:

(۱) بنیادی افعال: آجانا، جانا، کھانا، پینا، چلنا، بیٹھنا، سونا، مرنا، کرنا وغیرہ۔

(۲) بنیادی تصریفی قواعد: یعنی فعل، اسم اور ضمیر کی تصریف کے لاحقے جن سے زمانہ، تذکیر و تانیث اور واحد جمع کا اظہار ہوتا ہے۔ان کے علاوہ بنیادی الفاظ کے کچھ اور گروہ یہ ہیں۔

(۳) بنیادی ضمائر: میں، ہم، تو، تم، آپ، وہ، کس، جس وغیرہ۔

(۴) بنیادی اعداد: ایک، دو، تین، چار...دس، گیارہ، بارہ....بیس، تیس، سو وغیرہ۔

(۵) بنیادی رشتے: ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، چاچا، ماموں وغیرہ۔

(۶) بنیادی اعضائے جسم: آنکھ، ناک، کان، منھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ۔

گیان چند نے ان بنیادی الفاظ کی بنیاد پر اردو، ہندی اور کھڑی بولی کو ایک قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق کھڑی بولی مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، لیکن کھڑی بولی اور شورسینی اپ بھرنش کے رشتوں پر انھوں نے قطعی رائے نہیں دی ہے اور اردو کے آغاز کے سلسلے میں یہ اصولی بات کہی ہے:

''اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈھنا چاہیے، اوّل کھڑی بولی کا آغاز، دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول، جس کا نام اردو ہوجاتا ہے۔ میرامن سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک نے دوسری منزل کے بارے میں بات کہی ہے، جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے پہلی منزل پر زور دیا ہے۔''

1.9 مرزا خلیل احمد بیگ کا نظریہ:

مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی کتاب ''اردو کی لسانی تشکیل'' میں اردو زبان کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے شورسینی اپ بھرنش کو اردو کی اصل قرار دیا ہے۔ اپ بھرنشوں کا دور ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء رہا۔ اس کے بعد اپ بھرنشوں کے ارتقا کی رفتار تھم گئی اور مختلف اپ بھرنشوں سے جدید ہند آریائی زبانیں ابھرنے لگیں۔ اپ بھرنشوں سے جدید ہند آریائی زبانوں کے ابھار کا یہ دور گیارہویں صدی عیسوی کا ہے۔ اسی دور میں شورسینی اپ بھرنش سے اردو کا ابھار ہوا۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے ابھار کے دور کی اس زبان کو ''پیش اردو'' کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پیش اردو کا باقاعدہ آغاز ۱۱۹۳ء سے ہوتا ہے جو دہلی میں مسلم حکمراں کے ورود کا زمانہ ہے، لیکن وہ اردو کی پیدائش کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں کیوں کہ دہلی میں مسلم سلطنت قائم ہونے سے پہلے اردو اپنے ابھار کے دور سے گزر چکی تھی۔ انھوں نے سنیتی کمار چٹرجی کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے دیگر جدید آریائی زبانوں کی رفتار میں تیزی آنے کے ساتھ اردو کے ارتقا کو بھی رفتار ملی۔ بقول سنیتی کمار چٹرجی:

''اگر مسلمان شمالی ہندوستان میں نہ آتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش ہوجاتی لیکن ان کے ادبی آغاز وارتقا میں ضرور تاخیر ہوجاتی۔''

مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق تیرہویں صدی سے سترہویں صدی تک اردو اپنے لسانی ارتقا کا ایک دور پورا

کر لیتی ہے اور اٹھارہویں صدی سے یہ اپنے ارتقا کے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے۔

1.10 خلاصہ:

اردو کی ابتدا، مولد و منشا، زمانۂ آغاز اور سرچشمۂ زبان کے تعین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے رائے دہندگان کے پہلے گروہ میں زیادہ تر وہ حضرات شامل ہیں جو لسانیات کے اصولوں سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے تاریخی صورت حال اور قیاس کی بنیاد پر رائیں دی ہیں۔ ان میں ہندوستانی علما اور شاعر و ادیب بھی ہیں اور یوروپی مستشرق بھی۔ اس گروہ سے متعلق حضرات کی رائے میں اردو ایک مخلوط زبان ہے جس کا وجود باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں کے باشندوں کی زبانوں کے میل کا نتیجہ ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر محمد حسین آزاد اور ان کے بہت سے ہم نواؤں نے اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ قرار دیا۔ ان کے اتباع میں سید سلیمان ندوی نے اردو کا رشتہ سندھی سے استوار کیا، نصیر الدین ہاشمی نے دکنی سے اور محمود شیرانی نے پنجابی سے۔ یہ اور بات ہے کہ محمود شیرانی نے اردو کو پنجابی سے متعلق کرنے کے سلسلے میں کافی لسانی شواہد فراہم کیے۔

اردو کے آغاز و ارتقا سے بحث کرنے والے دوسرے گروہ میں بیش تر ماہرین لسانیات ہیں جنھوں نے اردو کے قدیم مواد کے لسانی تجزیوں کی بنیاد پر اپنے نظریات پیش کیے۔ ان کے درمیان بھی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ اس سلسلے کا پہلا اہم نام محی الدین قادری زور کا ہے۔ انھوں نے اردو کی بنیاد سرزمین پنجاب میں پڑنے اور دہلی میں اس کے نشو و نما ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ زور نے اردو کا ماخذ اس زبان کو قرار دیا جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی اور اس کا علاقہ موجودہ شمال مغربی سرحدی صوبے سے الٰہ آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ دیکھا جائے تو زور نے معمولی تبدیلی اور لسانی دلائل کے ساتھ شیرانی کے نظریۂ پنجاب کو ہی آگے بڑھایا۔

مسعود حسین خاں نے اردو کے پنجابی سے مشتق ہونے کے نظریے کو قدیم اردو کے لسانی تجزیے اور تقابلی مطالعے کی بنیاد پر رد کیا۔ خاں صاحب کے مطابق قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی، ساتھ ہی اردو پر نواح دہلی کی دیگر بولیوں یعنی کھڑی، میواتی اور برج کے اثرات ہونے کی بات کہی۔ انھوں نے اردو کی بنیاد کسی ایک زبان پر ہونے کا واضح نظریہ پیش نہیں کیا۔

شوکت سبزواری اردو کی بنیاد کی تلاش میں پراکرت دور تک پہنچے اور اردو پر پالی کے اثرات کی نشان دہی کی۔ آگے چل کر انھوں نے اردو کی اصل کھڑی بولی کو قرار دیا۔ ان کے نظریے کی بنیاد اردو اور کھڑی بولی کی قواعدی یکسانیت پر قائم ہے۔ انھوں نے اردو کو شورسینی اپ بھرنش کی شاخ ماننے سے انکار کیا اور گریرسن کے مغربی ہندی کے تصور کو بھی رد کیا۔

شوکت سبزواری کی تائید میں سہیل بخاری نے بھی اردو کو کھڑی بولی کا روپ قرار دیا تھا، لیکن بعد میں انھوں نے

اردو کو غیر آریائی زبان کہہ کر اس کی جنم بھومی اڑیسہ ہونے کا جو نظریہ پیش کیا اسے ماہرین نے یکسر مسترد کر دیا۔

گیان چند بھی اردو کو کھڑی بولی سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی ابتدا و ارتقا سے متعلق دیگر ماہرین کے نظریات سے بھی بحث کی ہے اور ان تمام نظریات کو رد کیا ہے جو اردو کو کھڑی بولی کے علاوہ کسی اور زبان سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ گیان چند نے اردو کے بعض بنیادی الفاظ اور قواعدی نظام کو بنیاد بنا کر کھڑی بولی اور اردو کی مماثلت کو ثابت کیا اور یہ بتایا کہ کسی زبان کے ماخذ کی تلاش اسی اصول پر کی جانی چاہیے۔

مرزا خلیل احمد بیگ نے اردو کے آغاز و ارتقا کے دیگر نظریات سے بحث کرتے ہوئے اردو کو شورسینی اپ بھرنش پر مبنی قرار دیا۔ اپ بھرنشوں کا ارتقا رک جانے کے بعد گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کو انھوں نے جدید ہند آریائی زبانوں کے ابھار کا دور قرار دیا۔ ان کے مطابق اردو بھی اسی دور میں شورسینی اپ بھرنش کی جانشیں کی حیثیت سے ابھری اور تیرہویں صدی آتے آتے اس نے اپنی شناخت قائم کر لی۔

اردو کے برج بھاشا، پنجابی یا کسی اور زبان سے مشتق ہونے کے نظریات کو مسترد کرتے ہوئے بیش تر ماہرین نے کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیا ہے۔ بعض ماہرین نے کھڑی بولی کے تعلق سے کوئی واضح نظریہ قائم نہیں کیا ہے، تاہم وہ بھی اردو پر کھڑی بولی کے گہرے اثرات سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح اکثریت کی رائے اردو کے کھڑی بولی سے مشتق ہونے کے حق میں ہے جو نواح دہلی میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ نمو پذیر ہوئی اور مسلم حکومت کے قیام کے بعد تیرہویں صدی میں اپنی الگ پہچان بنا سکی۔

1.11 مشکل الفاظ کے معنی:

لفظ	معنی
ابتدا	شروعات
اتباع	پیروی، کسی کی راہ پر چلنا
اتصال	ملنا
احاطہ کرنا	دائرے میں لینا
اختلاط	میل جول
ارتقا	ترقی کرنا
استدلال	دلیل اور ثبوت پیش کرنا
اشتراک	شریک یا ساجھا ہونا

لفظ	معنی
اعداد	عدد کی جمع، گنتیاں
اعضا	جسم کے حصے
افعال	فعل کی جمع، وہ الفاظ جن سے کسی کا ہونا معلوم ہو۔
اکثریت	زیادہ تعداد، غالب
امتیاز کرنا	فرق کرنا، الگ کرنا
آغاز	شروع
آمیزش	ملاوٹ
تائید کرنا	حمایت کرنا، حق میں ہونا
تجزیہ	ٹکڑے کر کے دیکھنا یا سمجھنا
تذکیر و تانیث	مذکر و مونث
تردید	رد کرنا
تشکیل	شکل پانا، بننا
تصریفی قواعد	کسی بنیادی لفظ سے مختلف الفاظ و افعال بنانے کے قاعدے
تضاد	ضد ہونا، بے میل ہونا
تعین	متعین کرنا، طے کرنا
تقویت	طاقت پہنچانا، قوت دینا
جانشیں	جگہ لینے والا
جدید	نیا
خام	کچا
سلاطین	سلطان کی جمع، بادشاہ
شمال مغربی	اُتّر پچھّم کی طرف کا
صَرف	قواعد کی ایک شاخ جس میں ایک لفظ سے مختلف الفاظ ڈھالنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔
صرفی و نحوی ساخت	کسی زبان کا قواعدی ڈھانچہ

ضمیر	وہ کلمہ یا لفظ جو اسم کے بدلے بولا جائے۔ جمع، ضمائر
عہدِ حاضر	موجودہ زمانہ
لفظ	**معنی**
قدیم	پرانا
قیاس	اندازہ
لسانیات	زبانوں سے متعلق، زبانوں کے بارے میں جاننے کا علم
لسانی شواہد	زبان کی حالت یا صورت سے متعلق دلیل یا ثبوت
ماخذ	جس سے اخذ کیا جائے یا لیا جائے، سرچشمہ، منبع
ماخوذ	لیا ہوا، اخذ کیا ہوا
مبنی	جس پر بنیاد ہو، جس پر قائم ہو
مبہم	کسی بات کا واضح اور صاف نہ ہونا
مخلوط	اختلاط کیا ہوا، ملا جلا
مدلل	دلیلوں اور ثبوتوں کے ساتھ کہنا
مسترد کرنا	رد کرنا
مستشرق	وہ فرنگی جو مشرقی زبان یا علوم کے ماہر ہوں۔
مسلّمہ	مانا ہوا، تسلیم شدہ
مشتق	کسی سرچشمہ سے پھوٹ کر نکلا ہوا
مفروضہ	فرض کیا ہوا، مانا ہوا، خیالی
مماثلت	یکسانیت، ایک جیسا ہونا
منبع	جہاں سے پھوٹ کر نکلے، سرچشمہ
منتقل ہونا	جگہ بدل جانا
منشا	پیدا ہونے کی جگہ، جہاں سے کوئی چیز آ گے
مولد	پیدا ہونے کی جگہ
نحو	قواعد کی وہ شاخ جس میں مختلف طرح کے جملے بنانے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔

نواح	گرد، اطراف، آس پاس کا علاقہ
واضح	کھلا ہوا، سمجھ میں آنے والا، صاف
ہیولیٰ	ڈھانچہ
یکسانیت	مماثلت، ایک جیسا ہونا

1.12 نمونۂ امتحانی سوالات:

مندرجہ ذیل الفاظ کے جواب ۵۰ سے ۱۰۰ الفاظ میں دیجیے۔

۱۔ اردو اور برج بھاشا کے نظریے پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں ابتدائی دور کے رائے دہندگان کے نام بتائیے اور ان کے خیالات قلم بند کیجیے۔

۳۔ اردو کا پنجابی سے ماخوذ ہونے کا نظریہ کس کا ہے؟ اس نظریے پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں گیان چند کے نقطۂ نظر کو واضح کیجیے۔

مندرجہ ذیل سوال کا جواب ۵۰۰ سے ۸۰۰ الفاظ میں دیجیے۔

۵۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریات کا خلاصہ پیش کیجیے۔

1.13 مزید مطالعہ کے لیے نامزد کتابیں:

۱۔	اردو زبان کی تاریخ	مرتبہ مرزا خلیل بیگ
۲۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
۳۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خاں
۴۔	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی
۵۔	ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور
۶۔	داستان زبان اردو	شوکت سبزواری
۷۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین
۸۔	لسانیات اور اردو	محمود الحسن

○○○

اکائی (۳)

اردو ہندی کا باہمی رشتہ

ساخت:

3.0 اغراض ومقاصد

3 .1 تمہید

3.2 اردو کا تاریخی پس منظر

3.3 ہندی کا تاریخی پس منظر

3.4 فورٹ ولیم کالج اور اردو ہندی کی تفریق

3.5 اردو ہندی کش مکش کا آغاز اور انجام

3.6 اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہونے کی غلط فہمی

3.7 اردو ہندی کے سلسلے میں دیے گئے بیانات کے بعض اقتباسات

3.7.1 مہاتما گاندھی کی رائے

3.7.2 امرت رائے کے خیالات

3.7.3 ڈاکٹر گیان چند کا قول

3.7.4 ڈاکٹر رام کھلاون پانڈے کا قول

3.7.5 چندردھر شرما گلیری کا قول

3.7.6 ڈاکٹر تاراچند کا خیال

3.7.7 راجا لکشمن سنگھ کا قول

3.7.8 بابو شیو پرشاد کے بیانات

3.7.9 سرسید احمد خاں کا بیان

3.7.10 پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال

3.7.11 پروفیسر حکم چند نیر کا قول

3.7.12 سجاد ظہیر کا موقف

3.7.13 ڈاکٹر عبدالودود کا خیال

3.7.14 پنڈت آنند نرائن ملاّ کا قول

3.8 اردو ہندی میں مشترکہ تہذیب کی روایت

3.9 اردو اور ہندی کے باہمی رشتے

3.10 خلاصہ
3.11 مشکل الفاظ کے معنی
3.12 نمونہ امتحانی سوالات
3.13 مزید مطالعہ کے لیے نامزد کتابیں

☆☆☆

3.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد موجودہ ہندوستان کی دو اہم زبانوں اردو اور ہندی کے آپسی رشتے اور تعلق سے واقف کرانا ہے۔اس اکائی کا مطالعہ کر کے آپ یہ جان سکیں گے کہ:

- اردو اور ہندی میں زبان کی سطح پر کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔دونوں کی قواعد ایک جیسی ہے۔دونوں کھڑی بولی پر قائم ہیں۔
- دونوں زبانوں میں جڑواں بہنوں کا رشتہ ہے۔
- اٹھارہویں صدی عیسوی تک اردو اور ہندی کی تفریق نہیں تھی، انیسویں صدی میں ہندی اردو کا فرق نمایاں ہوا۔
- ہندی اور اردو کے اختلاف کو انگریزوں نے نمایاں کیا۔
- ہندی کی قدیم شکل برج اور اودھی میں ملتی ہے۔ہندی نے کھڑی بولی کا ڈھانچہ اردو سے لیا۔
- دونوں زبان کی سطح پر ایک سی ہیں لیکن دونوں کے ادبی روپ مختلف ہیں۔
- اردو اور ہندی ادب ہندوستانی تہذیب کے دو متوازی دھارے ہیں۔
- اردو اور ہندی کے رسم الخط الگ الگ ہیں۔
- فارسی آمیز اردو اور سنسکرت آمیز ہندی کی درمیانی اور عام فہم شکل کو ہندوستانی کا نام دیا گیا ہے۔
- ہندی کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔
- اردو اور ہندی میں جو انوکھا رشتہ ہے اس کی مثال دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔

1.1 تمہید:

اردو اور ہندی میں جڑواں بہنوں کا رشتہ ہے۔پہلی اکائی میں ہم نے جانا کہ ابتدائی دور میں اردو زبان کا نام

ہندوی اور ہندی تھا۔اس کے علاوہ دہلوی، گجری، دکنی، ریختہ زبان ہندوستان اور اردوے معلّٰی کے نام سے بھی اس زبان کو پکارا گیا۔ اسے اردو زبان کا نام اٹھارہویں صدی کے آخر حصے میں دیا گیا۔ ہم نے یہ بھی پڑھا کہ اردو ایک جدید ہندآریائی زبان ہے۔ اردو کی اصل کھڑی بولی ہے جو دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں دہلی اور مغربی اتر پردیش کے کچھ حصوں میں بوی جاتی تھی۔ کھڑی بولی کی ابتدائی خام حالت پر مسلم حکمرانوں کی زبانوں نے گہرا اثر ڈالا۔ تیرہویں صدی تک کھڑی بولی فارسی، عربی، ترکی اور نواح دہلی کی دیگر بولیوں کا اثر قبول کر کے ایک منفرد زبان بن گئی جس کے ابتدائی نمونے امیر خسرو کے کلام میں ملتے ہیں۔ آئندہ تین صدیوں میں اس کا ارتقا گجرات و دکن میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی تک یہ زبان عوامی رابطے کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ شعروادب کی ایک منفرد زبان کے طور پر ہندوستان گیر حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت تک شمالی ہندوستان میں اردو کے علاوہ برج اور اودھی ترقی یافتہ زبانیں تھیں اور ان میں بھی شعروشاعری ہورہی تھی۔ اردو اور ہندی میں علاحدگی نہیں تھی۔

اٹھارہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھا۔ انھوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا جس کے لیے ان کی سازشیں مسلسل جاری رہیں۔ کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کر کے زبان کے جھگڑے کی بنیاد رکھی، نام کا سہارا لے کر ہندی کو ہندوؤں کی قدیم زبان اور اردو کو مغلوں کی زبان قرار دیا۔ ہندوستانیوں کے دل میں یہ خیال بٹھایا کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ آگے چل کر انگریزوں کی سازشیں رنگ لائیں اور اردو ہندی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندی کے حامیوں نے اردو کو ہندی کی ایک ''شیلی'' قرار دیا۔ ہندی کے فروغ واشاعت کے لیے ادارے قائم ہوئے۔ ناگری پرچارنی سبھا نے ناگری رسم الخط کو دفتروں اور عدالتوں میں نافذ کرنے کا زوردار مطالبہ کیا۔ ورتمان ہندی نے کھڑی بولی کو دیوناگری رسم الخط میں اپنالیا۔ اس سے قبل ہندی ادب کے نمونے اودھی یا برج میں ملتے تھے۔ کھڑی بولی ہندی فورٹ ولیم کالج کے اثر سے وجود میں آئی۔ آزادی سے قبل اردو ہندی کے اختلافات سیاسی رنگ اختیار کر گئے اور آزادی کے بعد ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔

3.2 اردو کا تاریخی پس منظر:

شمالی ہندوستان میں مسلم حکومت کا قیام تہذیبی اور لسانی نقطۂ نظر سے ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ غزنوی بادشاہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پنجاب میں حکومت قائم کی جو تقریباً دوسو سال قائم رہی۔ انھوں نے لاہور کو دارالسلطنت بنایا۔ اس عرصے میں مسلمان سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے جن میں سے بیش تر کی زبان فارسی تھی اور کچھ ترکی بولنے والے بھی تھے۔ اس میل جول کے نتیجے میں پنجاب میں بولی جانے والی قدیم پنجابی پر مسلمانوں کی زبان کا گہرا اثر پڑا اور پنجابی کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل سامنے آئی۔ اسی بنیاد پر محمود شیرانی نے اردو کی جاے پیدائش

پنجاب ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ دعویٰ درست نہ سہی لیکن پنجابی کا فارسی سے متاثر ہونا تسلیم شدہ ہے۔

پنجاب میں تقریباً دوسو سال قیام کرنے کے بعد مسلمان حکمرانوں نے ۱۱۹۳ء میں دہلی فتح کیا اور دہلی اقتدار کا مرکز بن گئی۔ دہلی سلطنت کے قیام سے نواح دہلی کی بولیاں مسلمانوں کی زبان سے متاثر ہوئیں۔ اب مسلمانوں کی فارسی خالص نہیں تھی بلکہ اس میں پنجابی کی آمیزش ہو چکی تھی۔ دہلی اور نواح دہلی کی دو بولیاں کھڑی اور ہریانوی پہلے مرحلے میں اور بعد کے مرحلے میں برج بھاشا پنجابی آمیز فارسی سے متاثر ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ اثر قبول کرنے والی بولی کھڑی بولی تھی جو سو سال کے عرصے میں نئے رنگ روپ میں سامنے آئی۔ حکمراں طبقے نے اسی زبان میں عوام سے کلام کیا۔ حکمرانوں کی سرپرستی کے سبب یہ زبان ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی اہمیت کی حامل ہوگئی اور رفتہ رفتہ عوامی رابطے کی زبان بن گئی۔ ۱۲۹۴ء (؟) میں علاء الدین خلجی کے فتح دکن کے ساتھ یہ زبان دکن پہنچی اور دکن کے کثیر لسانی علاقے میں رابطے کی زبان بننے کے ساتھ شعروادب کی زبان بھی بن گئی۔ اس طرح اردو کا بنیادی ڈھانچہ کھڑی بولی کا ہے جس پر پنجابی، ہریانی، برج بھاشا کے اثر کے ساتھ سب سے گہرا اثر فارسی کا ہے۔ چوں کہ فارسی اثرات کے زیر اثر کھڑی بولی نے اپنا رنگ روپ بدلا اس لیے فارسی اس کے خمیر میں شامل ہوگئی۔ حالاں کہ اردو کے سرمایہ الفاظ کا پچھتّر فی صد ہندوستانی اور پچیس فی صد فارسی ہے، پھر بھی اردو کی نمایاں شناخت اس کی فارسیت سے ہے۔

کھڑی بولی اپنے نئے رنگ روپ میں ابتدائی دور میں ہندوی ہندی اور دہلوی کہلائی۔ گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کہی گئی۔ دکن میں کھڑی بولی اردو اس لیے بھی جگہ بنا سکی کہ اہل دکن نے فارسی سے بالارادہ پرہیز کیا۔ چنانچہ دکن میں اردو کے ارتقا کے تقریباً تین سو سالہ دور میں زبان پر ہندوستانی عناصر کا غلبہ رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جب یہ زبان پھر سے شمال پہنچی تو یہاں کے شعرا نے اس کی صفائی کی۔ صفائی یا اصلاح زبان کے اس عمل میں اردو کو اس کے خمیر سے جوڑا گیا یعنی اردو میں فارسی کا نمک تیز کیا گیا۔ اس کے باوجود اردو کا پچھتّر فی صد ہندوستانی پن اپنی جگہ قائم رہا اور زبان شعری اظہار کے لیے زیادہ چست و درست ہوگئی۔ مغلوں کے دور میں برج بھاشا بھی فارسی سے متاثر ہو کر نئے ذائقے کی شعری و ادبی زبان بن گئی۔ اس طرح فارسی کی چاشنی سے لبریز دو متوازی شعری دھارے بہ یک وقت بہنے لگے۔ ایک کھڑی بولی اردو کا اور دوسرا برج بھاشا کا دھارا۔ مرکز سے دور یورپ میں ایک تیسرا دھارا اودھی کا تھا۔

جب کھڑی بولی اردو، فارسیت سے دامن بچاتے ہوئے دکن میں پروان چڑھ رہی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں برج بھاشا، فارسی اثرات قبول کر کے شعروادب کی سلطنت پر قابض تھی۔ پھر جب شمال و جنوب ایک ہو گئے تو کھڑی بولی اردو کا دھارا سب سے آگے جا نکلا۔

3.3 ہندی کا تاریخی پس منظر:

ہندی اور اردو کی نسلی بنیاد ایک ہے۔ یہ دونوں کھڑی بولی پر قائم ہیں یا کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ ابتدا سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک ہندی اردو کا فرق محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ زبان کا نام یا رسم الخط کوئی مسئلہ نہیں بنا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں دونوں کا فرق محسوس کیا جانے لگا۔ یہ فرق زبان پر سنسکرت اور فارسی کے گہرے اثر اور رسم الخط سے نمایاں ہوا۔ چوں کہ کئی سو سال تک ہندوستان میں فارسی کا بول بالا رہا اس لیے جدید ہندوستانی زبان پر فارسی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ اثر سب سے زیادہ کھڑی بولی پر پڑا۔ جب فارسی کا زور کم ہوا تو ہندوستان کی قدیم ترین زبان سنسکرت کا اثر حاوی ہونے لگا۔ اسی کے ساتھ دیوناگری رسم الخط کا چلن بھی بڑھا۔ اس طرح فارسی رسم الخط میں فارسی آمیز کھڑی بولی، اردو کہلائی اور دیوناگری رسم الخط میں سنسکرت آمیز کھڑی بولی نے ہندی کا نام پایا۔

انیسویں صدی سے پہلے ہندی کی شکل میں برج اور اودھی میں لکھا گیا ادب موجود تھا۔ شری کرشن جی کی جنم بھومی متھرا اور اس کے آس پاس کا علاقہ برج بھاشا کا مرکز تھا۔ فارسی سے متاثر ہونے کے باوجود برج بھاشا پر حاوی اثر سنسکرت کا تھا۔ کرشن بھگتی کے نغمے برج میں لکھے گئے۔ اسی لیے برج نے متھرا اور آگرہ کی سرحد پار کر کے پریاگ، کاشی اور اجودھیا کے ہندو راجاؤں کے درباروں تک پہنچ بنالی۔ برج کے اہم مصنفوں اور شاعروں میں سورداس، مغل شہنشاہ اکبر، عبدالرحیم خان خاناں، رسکھان کیشو، چنتامنی، بھوشن، منی رام، بہاری، پدماکر وغیرہ رہے۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی ترجمانی کرنے کے سبب برج بھاشا کا دائرہ وسیع ہوا اور ترقی کرتی رہی۔

برج کے علاوہ ہندی کی قدیم شکل اودھی کے روپ میں بھی ہندو عقیدت کی ترجمانی کرتی رہی۔ اودھی کا مرکز رام چندر جی کی جنم بھومی اجودھیا کا علاقہ تھا۔ تلسی داس نے اپنا عظیم کارنامہ ''رام چرتر مانس'' اودھی میں پیش کیا۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو بھی اودھی کے شاہ کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اودھی میں لکھے گئے پریم مارگی شاعروں کے تخلیقی کارنامے اور برج میں بھگتی کال اور ریت کال کے شعرا کے کارنامے، ہندی زبان و ادب کی تاریخ کا قابل قدر حصہ ہیں۔ ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے برج اور اودھی کو مقدس زبانوں کی حیثیت حاصل رہی۔ سجاد ظہیر نے اسی بنیاد پر کہا ہے کہ ''ہندو تصورات و ادب کا ایک نرمل دھارا مسلمانوں کے عہد حکومت میں بڑی شان و شوکت سے بہتا رہا۔''

3.4 فورٹ ولیم کالج اور اردو ہندی کی تفریق:

انگریز افسروں کو ہندوستانی زبان اور تہذیب سے واقف کرانے کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں قائم ہونے والے اس کالج میں ہندوستانی زبان کے شعبۂ صدر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ انگریزوں کو تعلیم دینے کی غرض سے کالج میں قصے کہانیوں کی کئی کتابیں لکھوائی گئیں، زیادہ تر کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔ میر امن کا مشہور قصہ ''باغ و بہار'' کے نام سے اسی کالج میں لکھا گیا۔ میر شیر علی افسوس نے قصہ حاتم طائی لکھا۔

سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی لکھی۔ ان کے علاوہ میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری اور للو جی لال وغیرہ درجنوں مصنّفین نے اردو میں کتابیں لکھیں۔ خود شعبہ ہندوستانی کے صدر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اردو کے اچھے عالم تھے اور انھوں نے خود بھی اردو میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔ اس طرح اردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات بے حد اہم ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کالج کو انگریزوں نے اپنے سامراجی اور نوآبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ کالج کے ذریعہ لسانی تفریق کا بیج بویا گیا۔ کالج کے بانی لارڈ ولزلی تھے۔ سامراجیوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں مختلف علاقائی بولیوں کے درمیان فارسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دفتروں اور عدالتوں میں فارسی کا چلن ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی فارسی استعمال کی جاتی ہے۔ فارسی نے ہندوستانیوں کو زبان و تہذیب کے ایک اتحاد میں باندھ رکھا ہے۔ سامراجی نقطۂ نظر سے مشترکہ تہذیب کے اس اتحاد کو توڑنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مشترکہ عوامی زبان یعنی اردو کو فارسی سے جوڑ کر اسے مغلوں کی زبان قرار دیا۔ دوسری طرف اردو کے مصنف للو جی لال سے ''پریم ساگر'' اور سرل مصر سے ''ناسکیتو پاکھیان'' جیسی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھوائیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ کھڑی بولی کے ایک ایسے طرز کو عام کیا گیا جو سنسکرت آمیز ہونے کے سبب مشترکہ عوامی زبان سے مختلف تھا۔ یہیں سے اردو اور ہندی کی دو الگ الگ راہیں متعین ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ اس وقت شمالی ہندوستان میں رائج مختلف علاقائی بولیوں کو بھی ہندی کے مختلف روپ قرار دے کر ہندی کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ مشترک زبان میں تفریق کے اس عمل کے نتائج کو ڈاکٹر رام آسرا راز نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''اس سے پہلے اردو ہندی کی ملواں زبان کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے ملے جلے الفاظ کے استعمال سے وہ اجتناب نہیں پایا جاتا تھا جو بعد کی دونوں مخصوص زبانوں میں عموماً پایا جانے لگا۔ ناسخ کی تحریک اصلاح زبان نے اردو فارسی الفاظ کی کثرت کا رجحان تو پیدا کر ہی دیا تھا، للو لال کی پریم ساگر نے ہندی میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار کے رجحان کو اور بھی زیادہ شہ دی۔ رفتہ رفتہ دونوں زبانوں میں یہ قابلِ افسوس رجحانات اس حد تک بڑھتے گئے کہ ہندی والے عربی فارسی کے عام فہم الفاظ کے استعمال سے گریز کرنے لگے اور اردو والوں کو سنسکرت کے تدبھو، یعنی ترمیم شدہ الفاظ جو اردو کی سرشت میں رچ بس گئے تھے، کا استعمال بھی ناگوار کرنے لگا۔''

فورٹ ولیم کالج نے علاقائی زبانوں کو بڑھاوا دینے کی آڑ میں لسانی تقسیم اور مذہبی منافرت کو بھڑکانے کا کام کیا۔ انگریزوں کی یہی لسانی پالیسی تعلیمی زبان کے سلسلے میں بھی کارفرما رہی۔ لارڈ میکالے کی سفارش پر نچلی سطح پر ہندوستانی زبانوں

کواور اعلیٰ سطح پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔ علاقائی زبانوں کو فروغ دینے کے بہانے انگریزی زبان کی بالادستی قائم کرنے کی یہ کوشش تھی۔ یہ کوشش بھی آگے چل کر کامیاب ہوئی لیکن لسانی عصبیت کا زہر فوری اثر کرنے والا ثابت ہوا۔ حالاں کہ امرت رائے اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''انگریز فورٹ ولیم کالج میں پرانی مشترکہ ہندی/ ہندوی کی جدید ہندی اور جدید اردو میں تقسیم کرنے کے ذمے دار نہیں، کیوں کہ یہ کام پہلے ہی ہو چکا تھا۔ البتہ انھوں نے اپنے سامراج کو استعمال کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا اور اردو بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئی۔''

3.5 اردو ہندی کش مکش کا آغاز اور انجام:

انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جس لسانی اختلاف کو ہوا دیا وہ آگے چل کر شدت اختیار کر گیا۔ ہندی اور اردو کے حامی خیمہ بند ہو گئے۔ زبان کا فرق گہرا ہوتا گیا۔ دفتروں اور عدالتوں میں ناگری رسم الخط میں ہندی کو نافذ کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ اس مطالبے کو لفٹننٹ گورنر سر اینٹونی میکڈانل نے ۱۹۰۰ء میں منظور کر لیا۔ ہندی کے حامیوں نے ہندی زبان و ادب کے فروغ کے لیے ناگری پرچاری سبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن قائم کیا۔ ہندی والوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کی ایک شیلی قرار دیا۔ جواب میں اردو والوں نے ہندی کو تعصب اور فرقہ پرستی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زبان کہا۔ الزام تراشی کے اس سلسلے نے لسانی عصبیت کا بازار گرم کیا۔ اگرچہ جنگ آزادی میں اردو شاعری کا انتہائی اہم کردار رہا لیکن حصول آزادی کے بعد اردو کو ملک کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس پس منظر میں ہندوستان میں ہندی کو قومی زبان بنانے کا جواز فراہم ہو گیا۔

3.6 اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہونے کی غلط فہمی:

زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں زبانوں کو مذہب سے جوڑنے کا کام سامراجی قوتوں اور تقسیم کی سیاست نے کیا۔ ہم آئے دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام ہندوؤں کی زبان ہندی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح اردو تمام ہندوستانی مسلمانوں کی زبان نہیں۔ بنگالی ہندو اور مسلمان دونوں کی زبان بنگلہ ہے۔ کرناٹک اور تمل ناڈو کے مسلمان کنڑ اور تمل بولتے ہیں۔ اگر زبان کا کوئی مذہب ہوتا تو دنیا بھر میں جتنے مذاہب ہیں اتنی ہی زبانیں ہوتیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں پر مسلمانوں کی فارسی، ترکی اور عربی کا اثر پڑا۔ اس اثر سے یہاں کی زبانوں میں خوش گوار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس کے باوجود کسی ایک آریائی زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کسی زبان کے بولنے والوں میں ایک خاص مذہب کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو۔

اردو اور ہندی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں ہیں انھیں مشترکہ طور پر مختلف مذہب کے ماننے والوں نے رواج دیا۔ بول چال میں استعمال کرنے کے علاوہ شعروادب کی تخلیق میں بھی ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں رہی۔ قدیم دور پر نظر ڈالیں تو اودھی میں ملک محمد جائسی کی پدماوت، شیخ عثمان کی چترا ولی، برج بھاشا میں عبدالرحیم خان خاناں اور اس کھان جیسے بہت سے شعرا اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہیں۔ اسی طرح قدیم و جدید دور کے بے شمار ہندو شاعر و ادیب بھی اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ مثال کے طور پر سرب سکھ دیوانہ، اجے چند بھٹناگر، ٹیک چند بہار، ٹیکا رام تسلی، کانجی مل صبا، جسونت سنگھ پروانہ، راجا رام نرائن موزوں، گھنشیام لال عاصی، دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، فراق گورکھپوری، پریم چند، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک جیسے بے شمار غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اردو ہندی کو مذہبی رنگ دینے کا کام پہلے انگریزوں نے اور بعد میں اہل سیاست نے اپنے مفاد کی تکمیل کے لیے کیا۔

3.7 اردو اور ہندی کے سلسلے میں دیے گئے بیانات کے بعض اقتباسات:

انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے حصول آزادی تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہندی اردو کش مکش کا دور تھا۔ اس تعلق سے جو موافق، مخالف، معتدل اور انتہا پسندانہ بیانات سامنے آئے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

3.7.1 مہاتما گاندھی کی رائے:

''ہندی بھاشا میں اسے کہتا ہوں جسے اتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے..... ہندوستان کے اتری حصہ میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی بھاشا بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا کیا ہے۔ یعنی پڑھے لکھے ہندو، ہندی کو سنسکرت بھری بنا ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان اسے سمجھ نہیں پاتے۔ لکھنؤ کے مسلمان بھائی فارسی لدی اردو بول کر اسے ایسی شکل دے دیتے ہیں کہ ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ دونوں غیر زبانیں ہیں اور عام جنتا کے بیچ ان کی کوئی جگہ نہیں۔''

''ہندوستانی کا مطلب اردو نہیں بلکہ ہندی اور اردو کی وہ خوب صورت ملاوٹ ہے جسے اتری ہندوستان کے لوگ سمجھ سکیں اور جو ناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہو۔ یہ پوری راشٹر بھاشا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ ادھورا ہے۔ پوری راشٹر بھاشا سیکھنے والوں کو اب دونوں ہی لکھاوٹیں سیکھنی چاہئیں۔ راشٹر پریم کا ٹھیک یہی تقاضا ہے۔''

3.7.2 امرت رائے کے خیالات:

''یہ بات بالکل صاف ہے کہ اردو ہندی دو علاحدہ زبانیں نہیں ہیں۔ ان کو دو زبانیں کہنا لسانیات کے تمام اصولوں کی تکذیب ہے اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینا ہے..... اگر چہ اردو ادب اور ہندی ادب دو مختلف اور آزاد ادب ہیں، اردو اور ہندی دو علاحدہ زبانیں نہیں ہیں۔''

''تقسیم کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ دو لسانی رویوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ایک یہ کہ ہندی کو اب پوری طرح سنسکرت آمیز بنا دینا چاہیے اور فارسی اور عربی کی ملاوٹ سے بالکل پاک کر دینا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اردو کی اس ملک میں کوئی گنجایش نہیں تھی اور وہ ہندی کی ایک بولی سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں لسانی رویے غیر تاریخی اور ناقص ہیں۔''

3.7.3 ڈاکٹر گیان چند جین کا قول:

''صحیح صورت حال یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ کھڑی بولی کا جنم ہندی روایات اور ناگری رسم الخط میں ہوا لیکن آج اس کا جو روپ ہے وہ اردو کا سنوارا اور نکھارا ہوا ہے۔ کھڑی بولی کے ان دونوں روپوں کا ادب اور لسانی سرمایہ اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ انھیں دو زبانیں نہ ماننا حقیقت کی جانب سے آنکھیں موند لینا ہے۔''

''بیرونی مسلمان اپنے ساتھ نہ اردو لائے تھے نہ کھڑی بولی..... ہندوؤں نے کھڑی بولی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اسے پسند کر کے اس میں عربی فارسی الفاظ بڑھانے شروع کیے اور وہی کھڑی بولی کا اردو روپ کہلایا جس نے ہندی روپ کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔''

3.7.4 ڈاکٹر رام کھلاون پانڈے کا قول:

''آدھنک کال کے آرنبھ میں ہندوستانی یعنی اردو کو ہندی سے بھِنّ مانا جانے لگا۔ انگریزوں کی درشٹی میں ہندوستانی ہوئی مسلمانوں کی بھاشا جو بعد میں اردو کہلائی اور ہندی ہوئی ہندوؤں کی بھاشا۔''

3.7.5 چندردھر شرما گلیری کا قول:

''ہندوؤں کی رچی ہوئی کویتا جو ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوروی، دیس وادی، اودھی،

راجستھانی اور گجراتی آدمی ہی میں ملتی ہے۔ ارتھاتو، پڑی بولی میں پائی جاتی ہے۔ کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان ہندی کے ورتمان گدیہ پدیہ کو دیکھ کر یہ جان پڑتا ہے کہ اردو رَچنا میں فارسی عربی یا تدبھووں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تتسم اور تدبھور کھنے سے ہندی بنالی گئی۔''

3.7.6 ڈاکٹر تاراچند کا خیال:

''..... ہندوؤں کے لیے للولال جی، بدل مصر، بینی نرائن وغیرہ کو (ارباب فورٹ ولیم کالج سے) حکم ملا کہ نثر (گدھ) کی کتابیں تیار کریں۔ انھیں اور بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ادب یا ساہتیہ کی بھاشا تو برج تھی، لیکن اس میں گدھ یا نثر نام ہی کے لیے تھا۔ کیا کرتے، انھوں نے راستہ یہ نکالا کہ میرامن، افسوس وغیرہ کی زبانوں کو اپنایا۔ پر اس میں سے فارسی، عربی کے لفظ چھانٹ دیے اور سنسکرت اور ہندی (= برج، اور دیگر بولیوں) کے لفظ رکھ دیے.....اس طرح دس برس سے بھی کم مدت میں دونئی زبانیں اپنے اصلی گہوارے سے سینکڑوں کوس کی دوری پر ودیسیوں کے اشارے سے بن سنور، رنگ منچ پر آ کھڑی ہوئیں۔ دونوں کی صورت مورت ایک تھی، کیوں کہ دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں۔ پھر دونوں کے سنگار، کپڑے اور زیور میں کچھ فرق نہ تھا۔ پر دونوں کے مکھڑے ایک دوسرے سے پھرے ہوئے تھے۔ اس ذرا سی بے رخی نے دیس کو دبدھا میں ڈال دیا، اور اس دن سے آج تک ہم الگ الگ دوراہوں پر بھٹک رہے ہیں۔''

3.7.7 راجا لکشمن سنگھ کا قول:

''میری رائے میں ہندی اور اردو دو بہت مختلف زبانیں ہیں۔ اس ملک کے ہندو ہندی بولتے ہیں، جب کہ مسلمان اور وہ ہندو جنھوں نے فارسی پڑھی ہے، اردو بولتے ہیں۔ ہندی میں سنسکرت الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جس طرح سے کہ اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہندی بولتے وقت عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، اور نہ ہی میں ایسی زبان کو ہندی کہتا ہوں جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہو۔''

3.7.8 بابو شیو پرساد ستارہ ہند کے بیانات:

''نو وارد مسلم حکمرانوں نے اس بات کی قطعی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ ہندوستانی زبانیں سیکھتے،

بلکہ انھوں نے ہندوؤں کو فارسی سیکھنے پر مجبور کیا، نیز ہندی کہی جانے والی بولیوں میں فارسی کے الفاظ داخل کر کے زبانوں کی ایک نئی مخلوط کی شکل قائم کی جو اردو یا 'نیم فارسی' کہلائی۔''

''جس طرح اس نے (حکومت نے) پہلے فارسی زبان کو خارج کیا تھا اسی طرح وہ عدالتوں سے فارسی رسم خط کو ختم کر کے ہندی کو نافذ کرے۔ اس سے بہت سے فائدے ہوں گے.....اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ 'ہندو قومیت' کی بازیابی ہوگی۔''

''ہندوؤں کی نظر میں ہندی سے مراد ہے وہ زبان جس سے تمام عربی اور فارسی الحاقی مادے کا اخراج اور تنقیہ کر دیا گیا ہو.....انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو اور اس کا فارسی رسم خط مسلمانوں کی قوت اور اثر کی علامت بن گئے تھے۔''

3.7.9 سرسید احمد خاں کا بیان:

''ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی کو، جو مسلمانوں کی نشانی ہے، مٹا دیا جائے..... یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے، اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا، تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جاویں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ الّا اس میں صرف دو امر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل اہل ہند، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کی بھلائی چاہتا ہوں۔ دوسرے، بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے.....وہ ہرگز اس قابل نہیں ہونے کے جو اپنی بھلائی کے لیے کچھ کر سکیں۔''

3.7.10 پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال:

''.....اردو کے ایسے الفاظ جو اردو اور ہندی میں مشترک ہیں۔ تقریباً پچھتّر فی صد یعنی اردو کے سرمائے کا تین چوتھائی حصہ ہوئے، دو زبانوں میں لسانی اشتراک کی یہ غیر معمولی مثال ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کی اردوئیت انھیں ایک چوتھائی الفاظ سے قائم ہوتی ہے جو عربی فارسی اور ترکی کے سرچشمے سے آئے ہیں۔ اسی طرح اردو کی مخصوص چستی اور کھنک بھی

سامی اور ایرانی ماخذ سے آئی ہوئی آوازوں سے پیدا ہوئی ہے، پھر بھی کسی دو زبانوں میں تین چوتھائی الفاظ کا مشترک ہونا، مغلیہ ڈھانچے کا ایک ہونا، بنیادی لفظیات یعنی اعداد، ضمائر اور حروف جار کا ایک ہونا اور عوامی محاوروں اور کہاوتوں کا ایک ہونا لسانی اشتراک کی عجیب وغریب مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کی سب سے بڑی طاقت اردو ہے۔''

3.7.11 پروفیسر حکم چند نیر کا قول:

''اگر چہ انیسویں صدی کے آغاز ہی میں فورٹ ولیم کالج کے سربراہوں نے متعدد اردو کتابوں کو دیوناگری میں شائع کر کے اور للولال جی سے 'پریم ساگر' لکھوا کر کھڑی بولی پر مبنی شدھ ہندی کی بنیاد ڈال دی تھی، لیکن اس صدی کے وسط تک دیوناگری اور ہندی کا دائرۂ عمل فورٹ ولیم کالج کی چار دیواری، یا زیادہ سے زیادہ یورپی حکام کے ذہنوں تک محدود رہا۔ اس زمانے میں ہندی کو ہندوؤں کی قومی، تہذیبی اور عوامی زبان بنانے کے لیے سامراجی حکام کس طرح سرگاڑی اور پاؤں پہیا کیے ہوئے تھے اس کا اندازہ بنارس کالج (سابق سنسکرت و بعدۂ کوئنز کالج) کے پرنسپل اور شعبۂ انگریزی کے صدر ڈاکٹر جے. آر بیلن ٹائن کی رپورٹ سے بخوبی ہوسکتا ہے۔''

3.7.12 سجاد ظہیر کا موقف:

''ناسخ اور اس زمانے کے شعرا نے اردو کو صاف کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ ٹھیٹھ ہندی یا سنسکرت آمیز الفاظ کو ترک کر دیا جائے اور ان کی کدوکاوش کا مدعا الفاظ اور محاوروں کا صحیح اور مناسب استعمال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جملوں کی بندش سست اور ڈھیلی نہ ہو، اور یہ ایک بہت ضروری کام تھا۔ اگر انھیں ٹھیٹھ ہندی الفاظ سے نفرت ہوتی تو ان میں سے ایک نے رانی کیتکی کی کہانی نہ لکھی ہوتی، جس میں فارسی، عربی اور گنوار والفاظ کو ترک کر کے گویا خالص اردو یا ہندی لکھی گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ اردو میں فارسی اور مروّج عربی الفاظ کے استعمال سے وطن سے مغائرت کا جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔ آٹھ سو سال سے شمالی ہندستان میں فارسی کلچر کی سب سے بڑی زبان تھی۔ اب جو لوگ اور ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں، اپنے اس آٹھ صدی کے تہذیبی ترکے کو ہندستان کی کھڑی بولی میں شامل کرتے ہیں۔

ایسا تر کہ جواب بالکل ہندستانی بن گیا تھا، وہ اردو میں غیر ملکی فضا پیدا کرنے کے مجرم کس طرح کہے جاسکتے ہیں؟ انھوں نے تہذیب وتمدن کے ان شان دار درختوں کو جو صدیوں سے یہاں کی سرزمین میں پھل پھول رہے تھے، اردو کے نئے لگائے ہوئے باغ میں منتقل کر کے ہماری کلچر کو مالا مال کیا۔ اس کا ثبوت کہ یہ ایک فطری اور ضروری عمل تھا، یہ ہے کہ اردو کے بعض ہندو اساتذہ کے کلام میں مسلمانوں کے مقابلے میں فارسیت زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً لکھنؤ کے پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم، میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلے میں زیادہ فارسی آمیز ہے۔

کھڑی بولی میں فارسی اور فارسیت کی آمیزش اس عہد میں اتنی ہی فطری اور لابدی تھی، جتنا کہ کیشو داس، دیو اور بھوشن کی برج بھاشا میں سنسکرت کی آمیزش۔ دونوں اپنے اپنے روایتی تہذیبی مرکز سے کسبِ فیض کر کے اپنی اپنی زبانوں کا دامن وسیع کر رہے تھے۔''

''اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جدید ہندی نے کھڑی بولی کا ڈھانچہ اردو سے لیا، لیکن اس میں ان الفاظ، بندشوں اور ترکیبوں کو اور ان خیالات اور ادبی روایات کی روح بھری جو ہندو تہذیب کے زیر اثر صوبوں سے اودھی، برج بھاشا اور شمالی ہند کی دیگر عوامی بولیوں میں (مثلاً بریلی، راجستھانی، میتھلی) میں برابر موجود تھیں اور جن کا مسلسل ارتقا ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ منقطع ہوا، بلکہ اس میں زبردست ترقی ہوئی تھی، خود مسلمانوں نے اس ترقی میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔ وہ عوام جو شمالی ہند کے گاؤں گاؤں میں کبیر کے دوہے، تلسی کی رامائن، میرابائی اور سورداس کے گیت آلھا اور اودل سننے اور سمجھنے کے عادی تھے۔ وہ طبقے جو برج بھاشا کی زبردست اور زندہ ادبی تحریک کو تین سو سال تک برابر آگے بڑھاتے رہے تھے، ان تمام لوگوں کے لیے جدید ہندی تعصب، فرقہ پرستی یا تنگ نظری کی پیداوار نہ تھی، وہ ان کے تہذیبی ارتقا کا منطقی نتیجہ تھی۔''

بلاک۲: اردو کی ترقی وترویج میں اہم اداروں اور جماعت کا حصہ

اکائی۴: اردو کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ

اکائی۵: اردو کی ترقی میں دہلی کالج کا حصہ

اکائی۶: اردو کی ترقی میں صوفیا کرام کا حصہ

اکائی۴ اردو کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ

اکائی۵ اردو کی ترقی میں دہلی کالج کا حصہ

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 فورٹ ولیم کالج

1.3.1 فورٹ ولیم کالج کا قیام

1.3.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد

1.3.3 فورٹ ولیم کالج کے مصنفین

1.3.4 فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات

1.3.5 فورٹ ولیم کالج کا خاتمہ

1.4 دہلی کالج

1.4.1 دہلی کالج کا قیام

1.4.2 دلی کالج کے قیام کا مقصد

1.4.3 دلی کالج کے مصنفین

1.4.4 دہلی ورنیکلرٹرانسلیشن سوسائٹی

1.5 خلاصہ

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.7 سفارش کردہ کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد اردو ادب خصوصاً اردو نثر کی ترقی اور اس ترقی میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی خدمات کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سمجھ پائیں گے کہ:

- ☆ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اردو کی صورت حال کیا تھی؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد کیا تھا؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج کب اور کس نے قائم کیا؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج سے کتنے انگریز مصنفین وابستہ تھے؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج میں کس کس طرح کی اور کون کون سی کتابیں تالیف اور ترجم ہوئیں؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں کون کون تھے؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج میں کن کن زبانوں کا شعبہ تھا۔
- ☆ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی ترقی میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیا۔
- ☆ دلی کالج کے قیام کا کیا مقصد تھا؟
- ☆ دلی کالج کب اور کن حالات میں قائم کیا گیا؟
- ☆ دلی کالج کے اساتذہ میں کون لوگ شامل تھے؟
- ☆ دلی کالج میں کن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی؟
- ☆ دلی کالج کے قائم کرنے میں کون لوگ شامل تھے؟
- ☆ دلی کالج کے نصاب میں شامل کتابوں کی کمی کیسے پوری کی جاتی تھی؟
- ☆ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام کا کیا مقصد تھا؟
- ☆ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں کون کون سی کتابیں ترجمہ کی گئیں؟
- ☆ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج نے اردو زبان وادب کی کیا خدمت کی؟

1.2 تمہید:

انیسویں صدی اردو نثر کے لیے مبارک اور سازگار ثابت ہوئی۔ اسی صدی کے نصف اول میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ان کالجوں نے نہ صرف لسانی اور ادبی سطح پر انقلاب برپا کیا بلکہ ذہنی اور علمی سطح پر بھی تبدیلیاں لائیں۔ یوروپین سوداگروں، حاکموں اور ادیبوں کی وجہ سے اردو نثر کو شاعرانہ فضا میں پنپنے کا موقع ملا تو اردو نثر کی باضابطہ تحریک شروع ہوئی اور نثر کا ابتدائی اور سادہ اسلوب وجود میں آیا۔ مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف، تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ سنسکرت اور فارسی قصوں کے ساتھ ساتھ سائنسی اور علمی کتابیں اردو کے سانچے میں ڈھلی۔ ان ابتدائی کہانیوں اور داستانوں میں عام فہم اور آسان زبان استعمال کی گئی تو سائنسی اور علمی کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت مناسب اصطلاحات بھی تیار کیے گئے۔ گویا اس دور میں ان دو کالجوں نے جو کام کیا اس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے انھیں کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

طالب علموں کی سہولت کی خاطر اس اکائی میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں تاکہ انھیں اس اکائی کو پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

1.3 فورٹ ولیم کالج:

اٹھارہویں صدی کے آخر میں بھاگیرتی (موجودہ ہگلی) ندی کے ساحل پر ایک خوبصورت اور زندہ شہر وجود میں آچکا تھا۔ کئی حاظ سے یہ شہر نہ صرف عوام بلکہ خواص کی بھی توجہ اپنی جانب کروا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی جو 1757 میں ہی اپنے قدم مضبوط کرنا شروع کر چکی تھی اب ہندستان پر حکومت کے خواب دیکھنا شروع کر چکی تھی اور اس کے لیے کلکتہ سے بہتر مقام دوسرا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے یوروپی شہر کے ڈھانچے پر کلکتہ کی تعمیر و توسیع شروع کر دی تھی۔ اسی تعمیر و توسیع کی ایک اہم

کڑی فورٹ ولیم کالج تھا۔

1.3.1 فورٹ ولیم کالج کا قیام:

اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے ریاست کی باگ ڈور تقریباً سنبھال لی تھی اور انتظامی امور اور نظم ونسق سے متعلق احکام کلکتہ سے ہی جاری کیے جارہے تھے۔صدی کے آخر میں سیرام پور مشنری کا قیام عمل میں آچکا تھا،جس کا مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت تھا۔اب اردو کے لیے بھی ماحول سازگار ہو چکا تھا۔انگریزوں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر ہندستان پر حکومت کرنی ہے تو ہندستان کی زبان کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس وقت ہندستان کی لنگوا فرنکا تقریباً اردو ہی تھی۔اس لیے اردو کو اپنانے اور اسے سیکھنے کی غرض سے 10 جولائی 1800 کو کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔

1.3.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد:

ہندستان میں کی ریاست بنگالہ میں انگریزوں کی حکومت تقریباً قائم ہو چکی تھی۔ پلاسی کی جنگ 1757 میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد ریاست انگریزوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔ حالاکہ نام کے لیے نواب موجود تھے لیکن حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی ہی چلا رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ خود نواب کو محتاج بنا دیا گیا تھا۔ایسے میں کیوں نہ ملک پر حکومت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ریاست کے حکومتی انتظامات کو سنبھالنے کی غرض سے برطانیہ سے افسر آنے لگے تھے۔ چوں کہ وہ ہندستانی زبان وتہذیب سے ناآشنا تھے اس لیے انھیں اکثر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ان کی ان دقتوں کو دور کرنے کی غرض سے جان بارتھوک گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔اس کا ایک اہم مقصد ان غیر ملکی افسروں کو ہندستانی زبان کی تعلیم وتربیت دینے کے ساتھ ساتھ انھیں یہاں کی تہذیب سے بھی واقفیت کرانا تھا۔

1.3.3 فورٹ ولیم کالج کے مصنفین:

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد کو ذہن میں رکھ کر ملک کے مختلف حصوں سے منشی بلائے گئے۔انگریزوں کو زبان کی اہمیت اور طاقت کا بخوبی اندازہ تھا اسلیے پہلے تو چند انگریزوں نے خود اردو سیکھی اوراس کے بعد انھیں لوگوں کی نگرانی میں فورٹ ولیم قائم کیا گیا۔اس کے پہلے پرنسپل گلکرٹ انگریز ہی تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی منشی انگریز تھے جن کی تصنیفات وتالیفات نہ صرف راہ نماں ہیں بلکہ نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔ان میں سے چند اہم مصنفین کا تعارف یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

جان بارتھوک گلکرسٹ کی پیدائش 1759 میں ایڈن برا میں ہوئی۔ایڈن برا ہی کے جارج ہیرٹس اسپتال میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1782 میں بمبئی آیا۔ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے فوج میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔یہ گلکرسٹ کا ہندوستان میں پہلا ہی سفر تھا۔بمبئی میں مقامی باشندوں سے ملنے اوران سے گفتگو کے دوران انھیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ہی دشواریوں کو مدنظر رکھ کرانھوں نے ہندوستانی زبان سیکھنے کا ارادہ کیا۔انھیں اس کا احساس شدت سے ہوا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ہندوستانی (اردو) زبان کا سیکھنا اشد ضروری ہے۔اس کے بعد انھوں نے جلد ہی اتنی اردو سیکھ لی کہ استاد شاعروں بہ شمول شودا کے کلام کا مطالعہ کرنے اورانھیں سمجھنے اور سمجھانے لگے۔یہی نہیں انھوں نے 1792 اور 1796 کے درمیان اپنی گرامر اور لغت مرتب کر لی۔ہم جانتے ہیں کہ جب فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تو اس کی سربراہی کی ذمہ داری گلکرسٹ کو ہی دی گئی۔ چونکہ وہ خود اردو کے ایک اسکالر کی حیثیت حاصل کر چکے تھے اس لیے انھیں اردو ادب اور اردو کے ادیب وشاعر کا بخوبی علم تھا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پورے ملک سے تمام ہندستانی زبانوں کے لیے ان ادیب وشاعر کو یکجا کیا جو ان کے مقاصد کو پورا کر سکے۔ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج نے جدید نثر نگاری کی نہ صرف داغ بیل ڈالی بلکہ اسے اس مقام پر پہنچا جو اپنی مثال آپ ہے۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی گلکرسٹ کو چھاپہ خانہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے 1801 میں ہی کالج کے گورننگ کونسل کو اس کے بارے میں لکھا اوران کی درخواست منظور ہوئی اور ہندوستانی پریس کے نام سے چھاپہ خانہ شروع ہوا۔

جان بارتھوک گلکرسٹ کے ہندستان چھوڑنے کے بعد پروفیسر جیمس مویٹ اوران کے بعد پروفیسر ولیم ٹیلر نے ان کی جگہ لی۔ ولیم ٹیلر کے بعد اس عہدے پر **تامس روبك** فائز ہوئے۔ تامس روبک برطانوی فوج میں سپاہی کے طور پر شامل ہوئے تھے لیکن ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے لفٹننٹ اور پھر کیپٹن ہوئے۔ روبک گلکرسٹ کے کام سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے گلکرسٹ کے کام کو آگے بڑھایا۔ وہ گلکرسٹ کی طرح کالج کے منشیوں کے ساتھ ساتھ کالج کے باہر کے ادیب وشاعر کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔

فرانسس گیلڈون ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی ان کا اس کالج سے براہ راست رشتہ قائم ہوا تھا۔ گیلڈ ون فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے ہی سے تصنیف وتالیف کا کام انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے زبان کے ساتھ ساتھ لسانیات پر بھی کام کیا۔ انھیں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ بنگلہ زبان کا بطی خاصہ علم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور فارسی کی لغت کے ساتھ ساتھ بنگلہ لغت بھی ترتیب دی۔

میر بهادر علی حسینی کالج کے میر منشی تھے۔ میر حسینی کے آباواجداد کا وطن سبزوار تھا اور مغل سلطنت کے زمانے میں ان کا خاندان ترک وطن کر کے ہندستان آ کر دلی کے آس پاس بس گیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ تلاش معاش میں ان کے آباواجداد کو بنگال اور بہار کا بھی رخ کرنا پڑا ہوگا۔ میر بہادر علی حسینی کی زندگی کا بیشتر حصہ بہار اور کلکتہ میں گزرا۔ فورٹ ولیم کالج سے 1808 میں میر منشی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے لیکن 1816 تک کالج میں بحیثیت مترجم کام کرتے رہے۔

میر بہادر علی حسینی کی سبکدوشی کے بعد 1808 **میر شیر علی افسوس** جعفری فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کے میر منشی مقرر ہوئے۔ ان کے آباواجداد خاف (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا محمد مصطفٰے محمد شاہ کے عہد میں دلی آ گئے تھے۔ افسوس کی پیدائش 1736 میں دلی میں ہوئی۔ وہ 64 برس کی عمر میں عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ آئے۔ کالج کے قیام کے بعد گلکرسٹ کی سفارش پر شعبہ ہندوستانی کے نائب میر منشی مقرر کیے گئے۔ 19 ستمبر 1809 کو کلکتہ میں انتقال ہوا۔

حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے اہم منشیوں میں سے ایک تھے۔لیکن ان کو اتنی شہرت نہیں مل سکی جتنے کے وہ حقدار ہیں۔سید حیدر بخش حیدری کی ولادت 1760 میں دلی میں ہوئی۔ان کے آباواجداد تیمور کے حملے کے زمانے میں نجف سے ہجرت کر کے دلی آ گئے تھے۔حیدر بخش کو دلی راس نہیں آیا اور وہ ہجرت کر کے بنارس آ گئے۔ بنارس میں حیدری کو قاضی عبدالرشید جیسے فارسی اور عربی کے جید عالم کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا۔قاضی صاحب کی صحبت میں انھوں نے فارسی اور عربی بھی سیکھ لی جو ان کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس کی شہرت پورے ہندستان میں پھیل گئی۔ حیدری بھی اس کے بارے میں سنا اور چالیس سال کی عمر میں بنارس چھوڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ساتھ میں توشہ سفر کے طور پر اپنی تصنیف 'مہر وماہ' بھی لیتے آئے جسے انھوں نے گلکرسٹ کی خدمت میں پیش کیا اور گلکرسٹ کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں منشی مقرر ہو گئے۔ 1812 تک کلکتہ میں قیام رہا اس کے بعد وہ بنارس لوٹ گئے جہاں 1822 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میر امن دلی والے کو کلکتہ آنے سے پہلے شاعر یا ادیب کی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ جب دلی کی حالت بگڑی تو میر امن پٹنہ پہنچے۔ایک طویل مدت وہاں گزارنے کے بعد کلکتہ چلے آئے۔وہاں آنے کے دو برس کے بعد 1801 میر بہادر علی حسینی کے توسط سے گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی اور میر امن فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ملازم رکھ لیے گئے۔ یہاں صرف تین برس رہے اور اس دوران انھوں نے دو متابیں یعنی 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' لکھیں۔ 1806 تک کلکتہ میں مقیم رہے اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

مظہر علی خاں ولا بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور اہل قلم تھے۔ان کے جد امجد ترک النسل تھے اور اصفہان سے شاہ جہاں آباد آئے تھے۔ولا کی پیدائش ۱۱۷۵ ہجری کے آس پاس دہلی میں ہوئی۔ابتدا میں شہزادہ جہاں دار شاہ اور پھر اس کے بعد نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ رہے۔آصف الدولہ کے دربار سے الگ ہونے کے بعد مسٹر اسکاٹ کے ملازم ہوئے اور انھیں کے ساتھ مارچ 1800 میں کلکتہ آئے اور اسکاٹ کی ہی سفارش پر جان گلکرسٹ نے انھیں فورٹ ولیم کالج میں

درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ترجمہ، تالیف اور تصنیف کے کام پر مامور کیا۔

مرزا کاظم علی جواں فورٹ ولیم کالج کے مقبول اور معتبر تنخواہ دار منشیوں میں سے ایک تھے۔ وہ دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا اصل نام حسن علی خاں تھا۔ ان کے آبا واجداد بھی مغلیہ دور حکومت میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ تلاش معاش میں وہ دلی سے لکھنو آئے پھر وہاں سے عظیم آباد میں کچھ دنوں مقیم رہے۔ 1800 میں کرنل اسکاٹ کی سفارش پر گلکرسٹ نے انھیں فورٹ ولیم کالج میں منشی مقرر کیا۔ کاظم علی جواں 1800 سے 1816 تک کالج سے بحیثیت مئولف، مترجم اور مصحح وابستہ رہے۔ اس طرح انھوں نے کلکتے کو ہی اپنا مسکن بنالیا اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

حفیظ اللہ احمد بردوانی فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ بنگال کے بردوان کے رہنے والے تھے اور تامس روبک کے زمانے میں خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے تھے۔

خلیل احمد خاں اشك دلی میں پیدا ہوئے اور فیض آباد کو اپنا وطن بنایا۔ ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہی حاصل کی۔ 1801 میں کلکتہ آئے۔ کاظم علی جواں کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں ملازمت ملی لیکن جلد ہی ان کی یہ ملازمت جاتی رہی۔ ہرنگٹن کی سفارش پر انھیں دوبارہ منشی رکھا گیا تب انھوں نے اپنا بہترین کام کیا اور کئی اہم کتابیں یا لیف اور ترجمہ کیں۔

بینی نرائن جہاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ تلاش معاش کے لیے شہر شہر بھٹکتے رہے۔ لاہور سے دلی آئے وہاں کامیابی نہیں ملی تو لکھنو کا سفر کیا۔ وہاں بھی مایوسی ہی ہاتھ لگی تو کلکتے کا قصد کیا۔ کلکتہ آنے کے بعد کئی برسوں تک کامیابی نہیں ملی۔

للولال جی کب فورٹ ولیم کالج کے شعبہ بھاکا (برج بھاشا) کے میر منشی تھے۔ للولال جی کب نے بھاکا میں ترجمہ وتالیف کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان میں بھی کتابیں لکھیں اور ولاں اور جواں کو ترجمے کرنے میں مدد کی۔ للولال گجرات کے رہنے والے تھے لیک ان کا خاندان ایک طویل عرصہ سے آگرے میں آباد تھا۔

تارنی چرن مترا کوفورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں اہمیت حاصل ہے۔تارنی چرن بنگال کے سپوت ہیں جن کو ہندوستانی زبان سے بے حد شغف تھا۔ضلع ہگلی کے ایل گاؤں میں 1772 میں وہ پیدا ہوئے لیکن ان کا خاندان کلکتے میں آباد ہو گیا تھا۔ان کا خاندان فارسی، عربی اور اردو زبان کا دلدادہ تھا یہی وجہ ہے کہ تارنی چرن کو بھی فارسی، عربی اور اردو زبان میں مہارت حاصل تھی۔وہ ایک ساتھ بنگلہ اور اردو دونوں زبانوں کے منشی اور بعد میں میر منشی رہے۔

ان منشیوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے منشی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے جن کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ان میں سے کچھ کو تو مقبولیت ملی اور زیادہ تر گمنام ہی رہے۔ان منشیوں میں میر معین الدین فیض، نہال چند لاہوری، باسط خان، مولوی عنایت اللہ شیدا، مرزا علی لطف، مرزا جان تپش، اکرام علی، مرزا مغل نشاں، حمید الدین بہاری خوان نعمت اور لالہ کاش راج کھتری اہم ہیں۔ان تمام مترجمین اور مؤلفین نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران بہت سی نا قابل فراموں کتابیں چھوڑی ہیں جو آج بھی ہمارے ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ان میں سے زیادہ تر پر تو ہماری نظر ہے لیکن اب بھی کچھ کتابیں ایسی ہیں جن ہم نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ان کتابوں میں سے بیشتر کا نسخہ یا کاپی کلکتہ کے ایشیائی ٹک سوسائٹی میں اب بھی موجود ہے۔

1.3.4 فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات:

جان بارتھوک گلکرسٹ نے صرف اردو کے قابل اور منجھے ہوئے ادیبوں، شاعروں اور عالموں کو فورٹ ولیم کالج میں یکجا ہی نہیں کیا بلکہ اپنی سرپرستی میں ان سے اردو نثر کی عمدہ داستانیں تالیف اور ترجمہ کروائیں اور خود بھی کئی معیاری اور اہم کتابیں ترتیب دیں۔

جان بارتھوک گلکرسٹ نے اردو قواعد اور لغت، پندنامہ سعدی کا ترجمہ (1802) میں اتالیق ہندی کے نام سے کیا۔انھوں نے یہ ترجمہ انگریزی اور ہندوستانی میں کیا تھا۔اشعار اور قطعات کے ترجمے میں انھوں نے منشی مظہر علی خاں ولا سے مدد لی تھی۔ولا کے علاوہ کالج کے دوسرے منشیوں نے بھی ان

کی مدد کی تھی

مشرقی زباں داں گلکرسٹ کی تیسری مفید اور عمدہ کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کی لندن واپسی کے بعد 1806 میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے دباچے میں اردو زبان کے مختلف ناموں پر بحث موجود ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اردو کو ہندی یا ہندوی کہنے کے بجائے ہندوستانی ہی کہنا چاہئے کیوں اگر ہندوستان کی کوئی زبان ہے تو وہ یہی ہے۔

ہندوستان کی مقبول ترین زبان رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔ 1808 میں ہندوستان کی مقبول ترین زبان یا ہندوستانی Strangers East Indian Guide to Hindustan پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے ساتھ اردو اور فارسی کے چند شاعروں کی غزلیں اور اس کے تراجم شامل ہیں۔

قواعد اردو: گلکرسٹ نے ہندوستانی گرامر انگریزی میں لکھی تھی۔ اردو زبان میں اس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اسے اردو رسم الخط میں لکھا۔ اس کتاب میں اردو قواعد کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کو بھی بیان کیا ہے۔

نقلیات ہندی کے نام سے گلکرسٹ نے اردو، رومن اور دیوناگری رسم الخط میں 1802 میں شائع کروایا۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر منشی تارنی چرن مترا نے ہندی کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا۔

مشرقی داستان گو 1803 میں شائع ہوئی۔ یہ گلکرسٹ کی عمدہ اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب میں گلکرسٹ نے تارنی چرن مترا، مظہر علی خاں ولا، میر بہادر علی حسینی اور للولال جی کب کی مدد سے حکیم لقمان کی حکایتوں اور مشرقی کہانیاں فارسی، سنسکرت اور برج بھاشا سے ترجمہ کیا۔

تامس روبک گلکرسٹ کے کام کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ کچھ نئے کام بھی کیے۔ ان کی کتابوں میں 'دی انالسس آف دی کالج آف فورٹ ولیم، اردو لغت اور لشکری لغت اہم ہیں۔ دی انالسس آف دی کالج آف فورٹ ولیم میں فورٹ ولیم کالج کے پندرہ سالہ عہد کی داستان اور روداد شامل ہے۔ روبک کی اس کتاب سے بہت سی ایسی کتابوں کا علم ہوتا ہے جو اب دستیاب نہیں ہے ساتھ ہی ساتھ کالج کے

منشی، پروفیسر، طلبہ اور تالیفات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ اردو لغت گلکرسٹ کی کتاب کا اختصار ہے جس میں ہندوستانی انگریزی الفاظ کا طویل فرہنگ بھی شامل ہے۔ لشکری لغت میں جہاز رانی سے متعلق تمام انگریزی اصطلاحات ہندوستانی بدل دئے گیے ہیں۔ اس طرح یہ لغت حالص ہندوستانی فوجیوں کے لیے 1810 میں ہندوستانی پریس سے شائع کی گئی۔

فرانسس گیلڈ ون نے کالج کے قیام سے قبل ہی 1796 میں فارسی انگریزی لغت 'اسلامی قوانین دفعہ کی ڈکشنری' ترتیب دی جو اس کے اگلے سال ہی کلکتہ سے شائی ہوگئی۔ اس کتاب میں انگریزی اور فارسی کے متبادل الفاظ کی طویل اور مفید فرہنگ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد ان کی ایک کتاب 'دلچسپ کہانیاں' کے نام سے فارسی سے بنگلہ اور انگریزی میں یوروپین سوداگروں اور سیاحوں کے لیے شائع کی گئی۔

میر بہادر علی حسینی نے کالج میں رہ کر کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں ان میں سب سے زیادہ شہرت 'اخلاق ہندی' کو ملی۔ لیکن ان کا بڑا کارنامہ 'تاریخ آشام' ہے جو شائع تو نہیں ہوسکا لیکن اس کا قلمی نسخہ کلکتہ کے ایشیائی ٹک سوسائٹی میں موجود ہے۔ ان کی کتابوں میں نثر بے نظیر کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ اردو کی مشہور مثنوی سحر البیان کا نثری خلاصہ ہے۔ منظوم مثنوی کو انگریز افسروں کے لیے آسان نثر میں منتقل کیا گیا ہے۔

کالج کے دوسرے میر منشی میر شیر علی افسوس کی دو تالیفات نہ صرف کالج کی بلکہ ان کی بہترین تالیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ اول گلکرسٹ کے ایما پر شیخ سعدی کی شہرہ آفاق تصنیف 'گلستاں' کا سلیس اردو میں 'باغ اردو' کے نام سے ترجمہ ہے۔ یہ کتاب انگریز افسروں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی غرض سے ترتیب دی گئی تھی۔ یہ ترجمہ 1802 میں مکمل ہوکر شائع ہوا۔ ان کی دوسری مشہور کتاب 'آرائش محفل' ہے۔ یہ سبحان رائے کی مقبول کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کا آسان ہندوستانی زبان میں خلاصہ ہے۔ اس کتاب کو فورٹ ولیم کالج میں دیے جانے والے تعلیم کے لیے شامل نصاب ہوئی۔ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں ہی اپنا دیوان 1802 میں ترتیب دیا تھا۔

حیدر بخش حیدری کی سب سے اہم اور معلومات افزا کتاب 'تاریخ نادری' ہے۔ حیدری نے

منشی محمد مہدی کی فارسی کتاب 'تاریخ جہاں گشائے نادری' کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا تھا جو نادر شاہ کے عہد حکومت کی قابل وثوق تاریخ ہے۔حیدری کا دوسرا اہم کارنامہ 'ہفت پیکر' ہے۔انھوں نے کالج کے عہدے داران کی فرمائش پر نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' کا منظوم ترجمہ 1805 میں کیا تھا۔ حیدری کی 'آرائش محفل' اردو میں 'قصہ حاتم طائی' کے نام سے مشہور ہے۔فارسی نثر کی کتاب کا ترجمہ حیدری نے 1802 میں کیا تھا جو ہندوستانی پریس سے 1805 میں شائع ہوئی۔ترجمہ ہونے کے باوجود یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بار بار چھاپنے کی ضرورت پیش آئی۔شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب 'بہار دانش' کا اردو ترجمہ کالج کے لیے حیدری نے 'گلزار دانش' کے نام سے کیا تھا۔بہار دانش ایک نیم تاریخی داستان ہے جس میں جہاں دار شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقے کی دلکش اور لطیف کہانی اثر انگیز انداز میں بیان کی گئی ہے۔کالج کی مشہور کتابوں میں سے ایک اہم کتاب 'توتا کہانی' ہے جسے حیدری نے قادری کی طوطی نامہ سے اخذ کیا تھا۔اسے 1812 میں ہندوستانی پریس سے کالج نے شائع کروایا۔کالج کی کتابوں میں جو شہرت باغ و بہار، مذہب عشق، آرائش محفل یا قصہ حاتم طائی کو ملی وہی شہرت توتا کہانی کے حصے میں آئی اور اسے کالج کے نصاب میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

میر امن دلی والے نے فورٹ ولیم کالج کی مقبول ترین کتاب 'باغ و بہار' 1802 میں لکھی۔ میر امن نے فارسی کی داستان چہار درویش کا ترجمہ آسان اور سلیس اردو میں کیا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میر امن نے فارسی کے بجائے عطا حسین تحسین کی داستان 'نوطرز مرصع' کو سامنے رکھ کر اسے عام بول چال کی آسان زبان میں لکھ دیا۔ترجمہ ہوتے ہوئے بھی یہ تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔میر امن کی دوسری کتاب 'گنج خوبی' ہے۔یہ فارسی کی ایک مشہور کتاب 'اخلاق محسنی' کا اردو ترجمہ ہے۔

مظہر علی خاں ولا نے کالج کے دس سال میں سات آٹھ کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔ان کی مشہور و معروف کتابوں میں 'جہاں گیر شاہی، تاریخ شیر شاہی، بے تال پچیسی، ہف گلشن، مدھونل' اور 'کام کنڈلا' ہیں۔بے تال پچیسی راجا بکر ماجیت کے عہد کے قصے ہیں۔ولا نے ان قصوں کو للولال جی کب کی مدد سے سنسکرت سے اردو میں 1802 میں ترجمہ کیا۔چوں کہ اس میں پچیس عبرت ناک اور اخلاقی

کہانیاں بے تال نے وکرماجیت کو سنائی تھیں اس مناسبت سے اس کتاب کا نام بے تال پچیسی ہے۔اس کے مطالعہ سے اس دور کے سماج اور تہذیب کا علم ہوتا ہے۔اسی طرح ولا نے ناصر بلگرامی کی فارسی کتاب ہفت گلشن کو گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ کیا۔یہ ترجمہ طالب علموں کے لیے 1801 میں مکمل ہوا۔اسی سال جیمس مویٹ کے ایما پر ولا نے 'اقبال نامۂ جہاں گیر' کا ترجمہ اردو میں کیا اور اس کا نام 'جہاں گیر شاہی' رکھا۔جہاں گیر کے عہد میں ترتیب دی جا چکی اس کتاب میں اکبر کے آخری ایام میں فتوحات، کشمکش، سیاسی قلابازی اور دشمنوں کے ساتھ جہاں گیری سپاہ کی خوں ریز معرکہ آرائیوں کا حال موجود ہے۔جہاں گیر شاہی کے چار سال بعد جیمس مویٹ کی ہی فرمائش پر ولا نے 'تاریخ شیر شاہی' کا ترجمہ کیا یعنی یہ ترجمہ 1805 میں مکمل ہوا۔شہنشاہ اکبر کے حکم پر خاں ککبو رنے ہمایوں اور شیر شاہ کے واقعات فارسی میں لکھے تھے جس میں شیر شاہ اور ہمایوں کی زندگی اور معرکہ آرائیوں کا حال ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔مدھو برہمن اور کام کنڈلا نامی ایک رقاصہ کے عشق کی داستان فارسی میں قصہ گل بکاؤلی، حاتم طائی اور توتا کہانی کی مانند ہی مقبول تھی۔ولا نے اس داستان عشق کو فارسی سے اردو میں 'مادھونل اور کام کنڈلا' کے نام سے 1804 میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔اس کے علاوہ ولا کا ایک دیوان بھی فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں ہی ترتیب پایا۔

مرزا کاظم علی جواں نے اپنے عہد ملازمت میں کئی کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں جن میں شکنتلا ناٹک، سنگھاسن بتیسی، بارہ ماسہ اور قرآن پاک کا ترجمہ قابل ذکر ہے۔جواں کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ شکنتلا ناٹک کا ترجمہ ہے۔یہ سنسکرت ایل شاہکار ڈراما ہے۔جواں نے اس کا ترجمہ سنسکرت سے نہیں کیا۔بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں نواز کبیشر نے اسے سنسکرت سے برج کی زبان میں کبت اور دوہوں میں لکھا۔یہاں سے للولال جی کب کی مدد سے جواں نے اردو نثر میں اس ناٹک کا ترجمہ کیا۔اکثر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جواں نے اسے ناٹک کے فارم میں ترجمہ کیا لیکن یہ درست نہیں ہے۔جواں نے اسے رواں نثر کی شکل میں ڈھالا۔ان کی دوسری مقبول کتاب 'سنگھاسن بتیسی' ہے۔اجین کے راجا بکرماجیت کے عدل و انصاف کی بتیس سنسکرت کہانیوں کو شاہ جہاں کی فرمائش پر سندر کبیشور نے برج کی بولی میں

لکھا تھا۔ جواں نے 1800 میں اسے برج سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ترجمہ کے اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے 1804 میں ترجمہ قرآن شریف اردو میں کیا۔ ان کی تالیف کردہ کتاب 'بارہ ماسا یا دستور ہند 1803 میں مکمل ہوئی۔ یہ ان کا منظوم کارنامہ ہے۔

حفیظ الدین احمد بردوانی نے علامہ ابوالفضل کی کتاب 'عیار دانش' کا ترجمہ 'خرد افروز' کے نام سے اردو میں کیا۔ اس ترجمے کو نہ صرف کالج کی تصنیفات میں بلکہ اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ تامس روبک کے ایما پر حفیظ صاحب نے یہ ترجمہ کیا جو 1815 میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

خلیل علی خاں اشک کی ہی نہیں بلکہ فورٹ ولیم کالج کی مقبول عام کتاب داستان امیر حمزہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں تالیف و ترجمہ کی گئی کتابوں میں اسے کم و بیش باغ بہار جیسا ہی درجہ دیا گیا۔ اس کے علاہ اشک نے قصہ رضوان شاہ، انتخاب سلطانیہ اردو اور واقعات اکبر جیسی اہم تاریخی کتابیں لکھیں۔

فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران بینی نرائن جہاں نے پہلے اپنا تذکرہ 1812 میں مرتب کیا۔ اس کے بعد 'چار گلشن اور تنبیہہ الغافلین جیسی اہم کتابیں لکھیں۔

فورٹ ولیم کالج کی مقبول ترین کتابوں میں للولال جی کب کی لطائف ہندیاور پریم ساگر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ للولال نے 'ودیا در پن، راج نیتی، مہا دیو بلاس اور سب بلاس جیسی کتابیں کالج کے لیے تالیف کیں۔ للولال کی لطائف ہندی، ودیا در پن اور پریم ساگر' اردو ساتھ ساتھ دیوناگری رسم خط میں بھی شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کا صرف رسم خط مختلف ہے زبان ایک ہی ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں ایک اہم کام یہ بھی شروع ہوا کہ ایک ہی کتاب مختلف رسم خط میں شائع ہوا۔ مثال کے طور پر تارنی چرن تارنی چرن مترا کی 'نقل نعمانی' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مترا نے اس کتاب میں حکایتیں گلستان سعدی، کلیلہ و ذمنہ، بہارستان جامی اور ایسی دوسری کتابوں سے 108 حکایتوں کا انتخاب کر کے اس کا ترجمہ 1801 میں مکمل کیا جو ایک سال کے بعد ہی اردو، دیوناگری اور بنگلہ رسم خط میں ایک ساتھ شائع کی گئی۔

کالج نے جب پند نامہ عطار کا اردو ترجمہ کروانے کا ب فیصلہ کیا تو ان کی نظر منشی میر معین الدین

فیض پر گئی اور فیض نے جان گلکرسٹ کی خاص ہدایت پر اس کا ترجمہ 'چشمۂ فیض' کے نام سے کیا۔

کالج کی مقبول کتابوں میں مذہب عشق کا شمار بھی ہوتا ہے۔اور اس کتاب کی وجہ سے ہی نہال چند لاہوری پہچانے جاتے ہیں اور کالج کے اہم منشیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔نہال چند نے عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف 'قصہ گل بکاولی' کو اردو کے قالب میں اس فنکاری سے ڈھالا کے تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔یہ قصہ اس قدر مقبول ہوا کہ کئی شاعروں نے اسے منظوم کیا۔پنڈت دیا شنکر نسیم نے اسی قصے کو اپنی اور اردو کی شاہکار مثنوی 'گلزار نسیم' میں بیان کیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی سرگرم زندگی یوں تو سولہ سال ہی بتائی جاتی ہے لیکن ان سولہ برسوں میں فورٹ ولیم کالج نے جتنا اور جتنی طرح کا کام کیا ہے اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔کالج کی جن کتابوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا وہ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ان اہم کتابوں کی مکمل فہرست بھی یہاں نہیں پیش کی جا سکتی ہاں میں سے چند کے نام درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔کالج کی اہم کتابوں میں 'گلشن ہند (باسط خان)، ہدایت الاسلام، صرف اردو اور اخلاق جلالی (مولوی عنایت اللہ شیدا)، تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف)، مثنوی بہار دانش اور شمس البیان (مرزا جان تپش)، اخوان الصفا (اکرام علی)، باغ سخن یعنی بوستان سعدی (مرزا مغل نشاں)، خوان نعمت (حمید الدین بہاری)، کربل کتھا یا دہ مجلس (منشی محمد بخش)، بحر عشق یعنی قصہ سیف الملوک کا (سید منصور علی حسینی)، بہار عشق (نور علی بن نذر علی) اور قصہ دل ربا اور دل آرام (لالہ کاش راج کھتری) اہمیت کی حامل ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی ان کتابوں نے کئی سطح پر اردو نثر کی ترقی کی راہ ہموار کی۔ایک جانب مقفع و مسجع عبارت کے بجائے عام فہم اور سلیس نثر میں نہ صرف ادب پارے بلکہ شاہکار ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے اس کی عملی مثال پیش کی۔باغ و بہار کی شکل میں ہمارے سامنے اس کی بہترین مثال موجود ہے۔دوسری جانب داستان کا اسلوب متعین کرنے میں کالج نے اہم کارنامہ انجام دیا۔باغ بہار، آرائش محفل اور توتا کہانی کا اسلوب اور ان کی داخلی فضا نے اس سلسلے میں راہ نمائی کا کام کیا۔اس کے ساتھ ساتھ اردو میں پہلی بار ایک منظّم اور وسیع پیمانے پر باضابطہ نہ صرف ترجمے کی اہمیت کو اجاگر کیا بلکہ بے شمار ترجمے کروائے

اور اسے شائع کیا۔فورٹ ولیم کالج نے بہت سی تاریخ کی کتابوں کے بھی تراجم کروائے۔گویا یہاں سے ترجمے کی ایک ایسی روایت کا آغاز ہوتا ہے جس سے آنے والوں نے اپنے چراغ روشن کیے۔نہ صرف اس زمانے میں بلکہ آنے والے زمانوں میں جتنے بھی اور جس زبان میں بھی ترجمے کا کام ہوا ان سب میں فورٹ ولیم کالج کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

1.3.5 فورٹ ولیم کالج کا خاتمہ:

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل کم وبیش یہی کام گلکرسٹ سیمنری (مدرسہ ہندی) کر رہا تھا۔ اس کام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدرسہ ہندی کو کالج کی شکل دی۔ہم جانتے ہیں کہ اس کا مقصد انگریز افسروں کو ہندوستانی زبان اور تہذیب سے آشنا کرانا تھا۔اس مقصد کے تحت ہندوستانی (اردو) زبان پر خاصا زور دیا گیا۔اس زمانے میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔کالج کے قیام کے بعد ابتدائی بیس برسوں میں ہی اتنا کام ہوا اور اردو میں سادہ اور سلیس زبان میں نثری کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان کو اتنی اہمیت دی گئی کہ 1935 تک فارسی کا زور نہ صرف ماند پڑتا نظر آیا بلکہ فاسی کی جگہ اردو نہ لے لی۔اب سرکاری کام کاج اردو میں ہونے لگے یہاں تک کہ کچہری اور انتظامی امور کی زبان کا درجہ بھی اردو کو ہی حاصل ہو گیا۔ساتھ ہی ساتھ نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کے انتظامی امور پر کمپنی کا قبضہ ہونے لگا۔ان کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا کہ وہ جب اور جیسے چاہتے تھے حکومت کرتے تھے۔1941 کے آس پاس کمپنی کو یہ احساس ہو گیا کہ کالج سے جو کام لینا تھا وہ لے چکے اس لیے اب ان کی دلچسپی کالج میں کم ہونے لگی تھی۔کالج کے بجائے اب ان کی دلچسپی ہندوستان پر باضابطہ حکومت کرنے میں تھی۔ہم جانتے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے نہ صرف ہندوستان کی بہت سی ریاستوں پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا بلکہ مغلیہ حکومت کو بھی لال قلعہ میں مقید کر دیا تھا۔اور پھر 1857 کی جنگ نے تو یہ فیصلہ کر ہی دیا کہ اب برطانوی حکومت ہی ہماری حاکم ہے۔

جب ہندوستان پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا تو یہ واضح ہو گیا کہ اب انھیں کسی خاص کالج کی ضرورت

نہیں ہے اور 1858 ہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس کی اہمیت کی ضرورت سے انکار کرتے ہوئے اسے بند کردینے کا حکم صادر کردیا۔ اس طرح 58 برسوں تک اردو کی ناقابل فراموش خدمت کرنے کے بعد یہ یادگار کالج بند کردیا گیا۔ کالج تو بند ہوگیا لیکن اس کی تالیفات کے شائع ہونے کا سلسلہ 1884 تک قائم رہا۔

1.4 دلی کالج:

ہم جانتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی ہی میں برطانوی کمپنی نے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا تھا۔ جیسے جیسے علاقے ان کی تحویل میں آتے جاتے تھے ویسے ویسے انھیں انتظامی امور میں مزید لوگوں کی ضرورت پیش آتی جاتی تھی۔ شروع میں برطانیہ سے افسر آتے۔ ان افسروں کو ہندوستانی عوام سے رابطہ کرنے میں نہایت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وجہ صاف تھی کہ وہ نہ صرف ہندوستانی زبان اور بولیوں سے ناآشنا تھے بلکہ ہندوستانی تہذیب کی بھی کوئی خاص جانکاری نہیں تھی۔ ہندستانی زبان اور تہذیب کے علم کے حصول کے لیے کمپنی کے منتظمین نے اپنے افسروں کی تربیت کی غرض سے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا۔ دو دہایوں کے بعد فورٹ ولیم کالج نے محسوس کیا کہ اپنے افسروں کی تربیت تو کی ہی جارہی ہے کیوں نہ ہندوستانیوں کو بھی مغربی علوم کا علم دے کر ان کی مدد لی جائے۔ دلی اس وقت بھی مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت تھی۔ حالاں کہ بادشاہ اب برائے نام ہی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر دلی پر قابض ہوگئے تو پورا ہندوستان ان کے ماتحت آجائے گا۔ اس لیے کمپنی نے دلی میں ہندوستانیوں کی تربیت کی غرض سے دلی کالج کے قیام کا فیصلہ کیا۔

1.4.1 دلی کالج کا قیام:

فورٹ ولیم کالج میں کے قیام کا مقصد برطانوی افسروں کی تعلیم وتربیت تھا۔ 1803 میں کمپنی کا قبضہ آگرہ اور دلی پر بھی ہونے لگا تھا۔ اور پھر اس کے بعد مقبوضات میں مزید اضافہ ہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے تربیت یافتہ انگریز افسر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انتظامی کام پر مامور کئے

جانے لگے تھے۔ان وسیع مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے ایک نئی انتظامی ضرورت کا احساس ہوا۔اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کمپنی نے یہ سوچا کہ اگر ہندستان پر باضابطہ حکومت کرنی ہے تو ہندوستانیوں کی مدد لینا اشد ضروری ہے۔اس مقصد کے تحت کمپنی نے 1825 میں دلی کالج قائم کیا۔

دلی کالج 'جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن' کی دلی شاخ کے سکریٹری جوزف ہنری ٹیلر (Joseph Henry Tallor) کی ان سفارشات اور رپور پر قائم کیا گیا جو جنوری 1824 میں حکومت کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔اس رپورٹ میں مشرقی علوم کی خستہ حالی پر بحث کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ان علوم کے فروغ کے لیے دلی میں ایک کالج قائم کیا جائے۔چناں چہ 1825 میں دلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔

1.4.2 دلی کالج کے قیام کا مقصد:

جب ہندوستان کے مختلف علاقوں پر ان کا تسلط بڑھنے لگا تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب زیادہ تعداد میں برطانوی افسر کو بلانے کے بجائے ہندوستانیوں کو اپنے ماتحت رکھا جائے۔گویا ہندوستانیوں کو اپنے ماتحت کر کے ان کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کی جائے۔اس کے لیے ان ہندوستانیوں کو تربیت دیے بغیر حکومت کے کام کاج میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔لہٰذا ہندوستانیوں کی تربیت کے غرض سے دلی کالج کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا۔اسر اس منصوبے کی کامیابی کا ثمرہ ہی ہے کہ کم وبیش ایک سو سال زبردستی اور ایک سو سال باضابطہ ہندوستان پر حکومت کرنے میں برطانوی کامیاب رہے۔دلی کالج کا قیام ہندوستان میں برطانوی سرکار کے واسطے ماتحت عملہ کی تربیت کے لیے عمل میں آیا مگر بالواسطہ طور پر اس کالج میں سائنسی علوم کی تدریس سے محدود سطح تک ہی صحیح مگر ایک سائنسی ثقافت کو فروغ حاصل ہوا اور ہندوستانی طلبہ کی ایک ایسی روشن خیال جماعت پیدا ہوئی جس نے ادب، تعلیم اور انتظامیہ میں اہم کردار ادا کیا۔

دلی کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھی۔یہاں تک کہ ریاضی کی تعلیم بھی نہ صرف اردو میں دی جاتی تھی بلکہ یہاں کے ریاضی

داں کی تعریف برطانیہ تک میں کی جاتی تھی۔

1.4.3 دلی کالج میں تعلیم کا نظام:

اب تک ہندوستان میں جو نظام تعلیم تھا اس کا انحصار مشرقی علوم پر تھا۔ان علوم کی تعلیم مدرسوں میں اردو، فارسی اور سنسکرت میں دی جاتی تھی۔ دلی کالج کے قیام کے بعد ایک انقلاب آیا اور تعلیم کی کایا پلٹ ہوئی۔ حالاں کہ دہلی اور بنارس کے کالجوں میں انگریزی مدرسے بھی ملحق کر دئے گئے تھے اور کلکتہ مدرسہ اور کلکتہ سنسکرت کالج میں بھی انگریزی جماعتوں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ چند درس گاہوں میں جغرافیہ، ہئیت ، ہندسہ اور تشریح کی تعلیم بھی جاری کی جا چکی تھی لیکن وہ اب تک ابتدائی صورت میں ہی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے لارڈ بینٹک نے 7 مارچ 1925 کو ریزولوشن پاس کیا کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ حکمت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے اور جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہییں ۔ اس طرح کالج کا قیام اور اس کے مقاصد طے ہونے کے بعد شعبے کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا۔ 1928 میں انگریزی کا شعبہ شروع ہوا۔ اس شعبے نے تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کی۔ اس کے بعد مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام شروع ہوا اور اب مشترکہ طور پر ہندوستانی اور مشرقی علوم کی تعلیم کا انظام کیا گیا۔ اس میں کالج کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ اس کامیابی کے بعد کالج انتظامیہ نے مختلف شعبے کی اصلاح کا منصوبہ بنایا۔ اس جانب قدم اٹھاتے ہوئے عربی اور فارسی شعبوں کی اصلاح کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ عربی اور فارسی شعبوں میں صرف مفید اور کارآمد علوم کا درس دیا جائے۔ اسی طرح جب کالج انتظامیہ کو یہ لگا کہ سنسکرت کی ترقی اور ضرورت زیادہ نہیں ہے تو اس کی جگہ پر ہندی کے شعبے کو زیادہ کارآمد اور بہتر بنایا جائے لیکن اس تجویز کو نامنظور کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کالج میں کلاسیکل زبانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ جدید زبانیں بھی تیزی سے پھل پھول رہی تھی۔ زیادہ تر مضمون اردو زبان میں ہی پڑھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ نیچرل فلاسفی، علم حیات، علم طبیعات، ہندسہ اور دوسرے مغربی علوم کی تعلیم بھی اردو

میں ہی دی جاتی تھی۔جن شعبوں کو اہمیت حاصل ہے ان میں شعبہ انگریزی،مشرقی شعبہ،شعبہ عربی،شعبہ فارسی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

1.4.4 دلی کالج کے اساتذہ:

دلی کالج کے قائم ہونے کے ساتھ ہی جے ایچ ٹیلر کالج کے سکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ مقرر کئے گئے۔ چوں کہ ان کے ذمے بہت سے دوسرے کام بھی تھے اس لیے وہ کالج کو خاطر خواہ وقت نہیں دے پا رہے تھے۔لہٰذا مجلس انتظامی نے 1837 میں مسٹر ٹیلر کو کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔مسٹر ٹیلر نے تیس برس تک دلی کالج کی ہیڈ ماسٹری کی اور تین برس تک اس کے پرنسپل رہے۔وہ طالب علم کے ساتھ پدرانہ سلوک کرتے تھے اور اسے اپنی اولاد کہتے تھے۔ان کے اس اخلاق کا طلبا پر بہت گہرا اثر تھا۔

کالج کی جنرل کمیٹی نے مشرقی شعبے کی ترقی اور انگلش انسٹی ٹیوشن کی عام نگرانی کی غرض سے 1841 میں مسٹر ایف بتروس کو پرنسپل بنایا۔وہ ایک قابل اور صاحب علم شخص تھے۔انھوں نے مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج میں قابل قدر کوشش کی اور دیسی زبان میں ترجمے کے ذریعے علم کی اشاعت میں گراں قدر کام کیا۔دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے قیام اور ترقی میں ان کا نمایاں کارنامہ ہے۔مسٹر بتروس نے بحیثیت کالج کے پرنسپل اور ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے سکریٹری جس مستعدی اور حقیقی سرگرمی اور خلوص سے اسے ترقی دینے اور کتابوں کے اردو ترجمے کرانے میں کوشش کی وہ نہایت قابل قدر ہے اور ان کا احسان اردو زبان پر ہمیشہ رہے گا۔ان کے زمانے میں مشرقی شعبہ انگریزی کے برابر ہو گیا تھا۔ان کے انگلستان لوٹنے کے بعد 1845 میں ڈاکٹر اے اسپرنگر کو یہ جگہ دی گئی۔ڈاکٹر اسپرنگر عربی زبان وادب کے عالم تھے اور انھوں نے اردو زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت میں بڑا کام کیا تھا اور مشرقی شعبے کے طالب علم کی تعلیم کے روح رواں تھے۔خاص کر مشرقی شعبے کے نصاب میں معقول اصلاحیں کیں۔

مسٹر بتروس،ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر نے صدق دل سے کالج کی خدمت کی اور اس کی ترقی اور اصلاح میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔طلبا اور اساتذہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی ان کی دل سے عزت

کرتے تھے۔خصوصاً مشرقی شعبے کی اصلاح اوراردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں سے متعلق مسٹر بتروس اوراسپرنگر نے جو سچی کوشش کی وہ قابل قدر ہے۔

کالج کے اساتذہ میں عربی کے صدر مدرس مولوی مملوک علی بڑے جید عالم تھے۔شہر ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک ان کے علم کے چرچے تھے۔عربی کے ساتھ ساتھ فارسی اوراردو میں بھی کمال رکھتے تھے۔انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ترجمے کا کام بھی بڑی مہارت سے کیا۔ترجمے کو تخلیق کا درجے دینے میں انھیں کمال حاصل تھا۔انھیں علم ہندسہ کا بھی اچھا خاصہ علم تھا۔

مولوی امام بخش صہبائی کالج میں فارسی کے صدر مدرس تھے۔وہ ایک اہم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے مصنف بھی تھے۔ان کی کتابیں کالج میں داخل نصاب تھیں۔انھوں نے کالج کے لیے کئی اہم کتابیں لکھی اورترجمہ کیے۔

مشہور ومعروف کتاب 'محاورات ہند' کے مصنف مولوی سبحان بخش دلی کالج کے قابل اور ہردل عزیز مدرس تھے۔پرنسپل کے رپوٹ میں ان کا ذکر بار بار ملتا ہے۔سبحان نے بھی درس وتدریس کے ساتھ ساتھ کالج کے لیے کئی اہم کتابیں لکھیں اورکالج کی ضرورت کے مطابق کئی اہم کتابوں کے ترجمے کئے جوشامل نصاب رہیں۔

ماسٹر وزیرعلی اور ماسٹر امیرعلی بھی دلی کالج کے قابل اورمشہوراساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ان تمام اساتذہ نے کالج اوراردو کی خدمت کے لیے خودکووقف کردیا تھا۔

ان اساتذہ کے علاوہ کالج کے فارغ ہونہار طالب علم کواسی کالج میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کا شرف حاصل ہوا۔ان طالب علموں میں سب سے اہم اور بڑا نام ماسٹررام چندرکا ہے۔رام چندرسائنس کے استادمقرر کیے گئے۔انھیں علم ریاضی پرمہارت حاصل تھی۔سائنس کی تعلیم اردوزبان میں دیتے تھے۔ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو میں الجبرااور علم مثلث (Trigenometry) پرکتابیں لکھیں جوشائع ہوکرکالج کے نصاب میں شامل ہوئیں۔ان کتابوں سے مشرقی شعبے کے طالب علم کو بہت فائدہ ہوا۔وہ اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت کرنے والے اورمحنت

سے پڑھانے والے مدرسوں میں شمار ہوتے تھے۔ ریاضی کے موضوع پر کئی اہم اور قابل قدر کتابیں لکھیں جن کی شہرت اور قدر برطانیہ تک پھیل گئی۔ ان کے ایجاد کردہ طریقے یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں رائج ہوئے۔

کالج کے طالب علموں میں ایک ہونہار طالب علم ضیاء الدین بھی تھے۔ یہ وہی ضیاء الدین ہیں جنھیں ہم شمس العلما ڈاکٹر ضیاء الدین کے نام سے جانتے ہیں۔ 1864 میں کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تقرر ہوا جو بعد میں عربی کے پروفیسر ہوئے۔

ایسے ہی طالب علموں میں پیارے لال آشوب بھی ہیں جو بعد میں کالج کے مدرس ہوئے۔ انھیں صہبائی اور رام چندر کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی کی بھرپور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار اور معاملہ فہم شخص تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ کئی اہم کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمے کیے جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی سے شائع کئے گئے۔

کالج کے دیگر ایسے طالب علم جو بعد میں کالج کے اساتذہ میں شامل کیے گئے ان میں مولوی ذکاء اللہ، بھیروں پرشاد اہم ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ فارسی کے استاد تھے۔ انھوں نے بہت سی اہم اور قابل قدر کتابیں نہ صرف کو بلکہ اردو ادب کو دی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اساتذہ میں میر اشرف علی، مولوی احمد علی، پنڈت رام کشن دہلوی، ماسٹر حسینی، ہردیو سنگھ، ماسٹر نور محمد اور مولوی حسن علی خاں قابل ذکر اساتذہ میں شامل تھے۔ ان تمام اساتذہ نے طالب علموں کو مختلف مضمون میں درس دینے کے ساتھ ساتھ ترجمہ وتالیف کا کام بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔

ان اساتذہ کے شاگرد اور ہم جماعت بہت سے ایسے ہیں جو جہاں اور جس شعبے میں رہے کالج کا نام روشن کیا۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں نے تعلیم کے شعبے میں نہ رہنے کے باوجود تصنیف وتالیف اور کئی اہم تراجم کیے جو ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی سے شائع بھی ہوئے۔ ایسے ہونہار طالب علموں میں مسٹر پتمبر، موتی لال دہلوی، پنڈت من پھول، میر ناصر علی، بھیروں پرشاد، حکم چند، نند کشور، پیرزادہ محمد حسین، ماسٹر جانکی پرشاد، پنڈت دھرم نراین، مولوی کریم الدین، پنڈت کاشی ناتھ، آتماب رام اور لچھمن داس وغیرہ

اہم ہیں۔ان طالب علموں نے کئی سطحوں پر کارہائے نمایاں انجام دیے۔طالب علمی کے زمانے کا ذکر کالج کی رپورٹ میں ملتا تو ان کی کتابیں ان کی علمیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

1.4.5 دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی:

دلی کالج قائم تو ہو گیا اور سائنسی علوم کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔دلی کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔اس زمانے میں اردو زبان میں سائنسی کتابوں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔کتابوں کی کمی کا احساس شدت سے کیا جا رہا تھا۔سائنسی کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ترجمے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے 'دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی' کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس سوسائٹی کا مقصد تدریسی ضرورت کے لیے جدید سائنسی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کروانا تھا۔مولوی عبدالحق نے ان مقاصد کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے ان میں سے چند کو پیش کیا جاتا ہے:

- ☆ سوسائٹی کا منشا تھا کہ انگریزی، سنسکرت، عربی اور فارسی کی اعلیٰ کتابیں اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کی جائیں اور دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔
- ☆ ابتدا میں یہ امید نہیں کی گئی تھی کہ ترجمہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا لیکن اس ارادے کے ساتھ کام شروع کیا کہ اوسط درجے کا بھی ہوگا تو اس کو کم تعداد میں شائع کیا جائے گا تاکہ اسے بہتر بنانے کے بعد پھر سے شائع کیا جاتا رہے۔اس درمیان اگر اس سے بہتر ترجمہ ہو جائے تو پہلے والے کو موقوف کر کے دوسرے کو ہی چھپوایا جائے۔
- ☆ دیسی زبانوں کی مفید جدید تالیفات اور انگریزی، سنسکرت اور عربی کی اعلیٰ کتابوں کے ترجمے چھ آنے سے لے کر ایک روپے فی صفحہ خریدے جائیں گے۔فارسی کتاب یا کسی دیسی زبان کا ترجمہ اس سے نصف شرح پر خریدا جائے گا۔
- ☆ ترجمے کے مفید ہونے نہ ہونے کا فیصلہ سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ کرے گی اور پہلے ان کتابوں کو شائع کیا جائے گا جو ضروری ہیں اور جو چار یا پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل نہ ہو۔

☆ سوسائٹی سے شائع شدہ کتابوں کی قیمت زیادہ نہیں ہوگی اور اشاعت کے اخراجات کا ایک بڑا حصہ اور بعض صورتوں میں تمام اخراجات سوسائٹی کے ذمے ہوگا۔

اس طرح ہندوستانی اور خصوصاً اردو زبان میں پہلی بار باضابطہ سائنسی کتابیں شائع ہوئیں۔ یہاں سے معیاری کتابوں کی اشاعت کی وجہ یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے۔ ابتدا میں مجلس انتظامی کے اراکین میں ٹی شگاف، سی گرانٹ، ای سی ریونشا، ڈبلیو سین کوئٹن، دوارکا ناتھ ٹیگور، ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) اور سکریٹری بتروس (Boutros) پرنسپل، دلی کالج جیسے عالم شامل تھے۔ سوسائٹی کی خرچ کا ایک بڑا حصہ چندے سے پورا کیا جاتا تھا اور چندہ دینے والوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ 116 چندہ دینے والوں میں 52 انگریز تھے تو باقی ہندوستانی۔ ان ہندوستانیوں میں بھی شاہ اودھ سے لے کر حیدرآباد دکن کے سالار جنگ، سراج الملک بہادر اور راجا رام بخش جیسے امیر کبیر لوگ شامل تھے۔

سوسائٹی نے کم و بیش ڈیڑھ سو کتابیں شائع کی جن میں غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ ان کتابوں میں درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی کتابیں بھی شامل تھیں اور ادب کے کم و بیش تمام اصناف کو برابر اہمیت دی گئی تھی۔ زبان، محاورات، صرف و نحو، تاریخ، لغات، قواعد وغیرہ سے متعلق بھی کتابیں شائع کی گئیں۔

دلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی شمالی ہند میں اردو زبان کے ترجموں کے مرکز بن گئے تھے اور یہاں سے جدید علوم کے ترجموں کی ایک سرگرم تحریک چل پڑی تھی۔ اس تحریک میں برطانوی سرکار کے ساتھ ساتھ مقامی حضرات کی مالی امداد بھی حاصل تھی۔ اردو زبان میں سائنسی اور مغربی علوم کے ترجمے کی تحریک میں کالج کے اساتذہ اور مقامی اشرافیہ طبقہ بھی جدوجہد کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جتنی تعداد میں اور جس معیار کے ترجمے ہوئے وہ اس سے پہلے تو کیا اس کے بعد بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔

1.5 خلاصہ:

فورٹ ولیم کالج میں جو نثری کتابیں تیار ہوئیں تھیں اس نے تخلیقی یا غیر تخلیقی سطح پر اسلوب کے بنیادی سانچے تیار کیے۔ حالاں کہ فورٹ ولیم کالج میں بنیادی کام ترجمہ اور تالیف کا ہوا مگر مترجمین اور مولفین نے اس کام کو نثر کے تخلیقی مقام کا درجہ عطا کروانے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے بعد اسلوب نثر میں فورٹ ولیم کالج ہی کی نمونہ سازی کے مطابق مستقبل کے نثری اسلوب استوار ہوتے دکھائی دئے۔ دلی کالج کے نثری اسالیب کا ابتدائیہ بھی فورٹ ولیم کالج ہی میں تشکیل پایا تھا۔

دلی کالج پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا اشتراک ہوا۔ ایک ہی جماعت میں مشرقی اور مغربی علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معمولات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا کام کیا۔ گویا ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد کا کام کیا۔ اس کالج کے توسط سے ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر مصنف اور انسان سامنے آئے جن کا احسان ہماری زبان و ادب اور قوم پر ہمیشہ رہے گا۔

برطانوی حکومت کے عزائم کچھ بھی رہے ہوں دلی کالج ایک نئے سائنسی شعور کا مرکز بن گیا۔ ہندوستان کے صدیوں پرانے ذہنوں میں پہلی بار حیات، کائنات اور علوم کے بارے میں نئے تصورات کی تعمیر کا نہ صرف سلسلہ شروع ہوا بلکہ فرسودہ تصورات کو رد کیا جانے لگا۔

فورٹ ولیم کالج کی میراث لسانی، ادبی اور ثقافتی تھی۔ قاری اور تحریر کے درمیان رابطہ کی سلاست پر زور دے کر فورٹ ولیم کالج نے انفرادی حیثیت سے ہندوستان میں پہلی بار ابلاغ کی اہمیت اور قدر و قیمت کو فروغ دیا تو دلی کالج نے لسانی اور ادبی ثقافت کے مقابلے میں سائنسی ثقافت کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے دلی کالج نے علمی ادب پیدا کیا۔

1.6 نمونہ امتحانی سوالات:

(الف) درج ذیل سوال کا جواب 30 سطروں میں لکھیے۔

ا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا تعارف پیش کیجیے۔

۲۔فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی کتابوں پر ایک مضمون لکھیے ۔

۳۔فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو ایک نیا اسلوب دیا۔اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۴۔دلی کالج کے لیے ترجمہ کی گئی کتابوں کی اہمیت بتائیے۔

۵۔ دلی کالج کے اساتذہ کا تعارف کروائیے۔

۶۔دلی کالج اور فورٹ ولیم کالج میں کیا فرق ہے۔تفصیل سے لکھیے ۔

۷۔فورٹ ولیم کالج میں تالیف و ترجمہ کی گئی داستانوں پر ایک مضمون لکھیے ۔

(ب)درج ذیل سوال کا جواب 15 سطروں میں لکھیے ۔

۱۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد بیان کیجیے۔

۲۔جان بارتھوک گلکرسٹ پر ایک نوٹ لکھیے ۔

۳۔فورٹ ولیم کالج کے انگریز مصنفین کا تعارف پیش کیجیے۔

۴۔میر امن اور باغ و بہار کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے ۔

۵۔دلی کالج کے اغراض مقاصد اور اس کے قیام پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۶۔دلی کالج میں کن کن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی؟

۷۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

۸۔ دلی کالج کے طالب علموں کا تعارف پیش کیجیے۔

1.7 سفارش کردہ کتابیں:

۱۔ تاریخ ادب اردو : پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

۲۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۔ مرحوم دلی کالج : مولوی عبدالحق

۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ : سید احتشام حسین

اکائی ۴ اردو کی ترقی میں صوفیاے کرام کا حصہ

ساخت:

4.0 اغراض ومقاصد

4.1 تمہید

4.2 صوفیانہ مسلک اور صوفی کا مفہوم

4.2.1 صوفی کی حیثیت مولوی عبدالحق کی نگاہ میں

4.3 ہندوستان میں صوفیوں کی آمد اور ان کے سماجی روابط

4.4 صوفیا کے ناقابل فراموش کارنامے

4.5 صوفیا کے اقوال اور کلام کی تاریخی اور لسانی اہمیت

4.6 ابتدائی دور کے صوفیا کے احوال وآثار

4.6.1 حضرت فریدالدین شکر گنج

4.6.2 حضرت شیخ حمیدالدین ناگوری

4.6.3 شیخ شرف الدین بوعلی قلندر

4.6.4 حضرت امیر خسرو

4.6.5 شیخ لطیف الدین دریانوش دہلوی

4.6.6 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

4.6.7 ابتدائی دور کے صوفیا کے چند اور اقوال

4.7 دکن وگجرات اور دیگر علاقوں کے صوفیا کے احوال وآثار

4.7.1 حضرت گیسو دراز بندہ نواز

4.7.2 حضرت قطب عالم وحضرت شاہ عالم

4.7.3 حضرت سید محمد جونپوری

4.7.4 شیخ بہاء الدین باجن

4.7.5 شیخ عبدالقدوس گنگوہی

4.7.6 شاہ محمد غوث گوالیاری

4.7.7 شیخ علی متقی

4.7.8 شیخ وجیہ الدین احمد علوی

4.7.9 قاضی محمود دریائی

4.7.10 شاہ علی محمد جیو گام دھنی
4.7.11 خوب محمد چشتی
4.7.12 شمس العشاق شاہ میراں جی
4.7.13 شاہ برہان الدین جانم
4.7.14 شاہ امین الدین اعلی
4.7.15 سید میراں حسینی شاہ
4.8 کبیر داس
4.9 صوفیا کے لسانی نمونوں کی نوعیت اور کیفیت
4.10 خلاصہ
4.11 مشکل الفاظ کے معنی
4.12 نمونہ امتحانی سوالات
4.13 مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابیں

☆☆☆

4.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد اردو زبان کی تشکیل کے دور میں زبان کو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلانے اور عوامی بولی کو تقریر وتحریر میں استعمال کرنے کے سلسلے میں صوفیاے کرام کی خدمات سے واقف کرانا ہے۔صوفیا کے اقوال وملفوظات کی شکل میں اردو زبان ک ابتدائی دور کے جو بیش قیمت نمونے باقی رہ گئے ہیں، ان کی لسانی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ سے آپ میں یہ استعداد پیدا ہو جائے گی کہ آپ:

- صوفی اور صوفیانہ مسلک کے مفہوم سے واقف ہو جائیں گے۔
- صوفیا کے سماجی روابط اور ان کے مقاصد کی جانکاری حاصل کرلیں گے۔
- تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک کے اہم صوفیاے کرام روشناس ہو جائیں گے۔
- مختلف ادوار اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے متعلق صوفیا کے اقوال وملفوظات سے شناسا ہو جائیں گے۔
- اردو زبان کے ابتدائی دور کے لسانی نمونوں سے واقفیت حاصل کرلیں گے۔
- اردو کی ابتدائی نشوونما اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں صوفیاے کرام کے کارناموں سے واقف

ہو جائیں گے۔

4.1 تمہید:

اردو زبان کے آغاز و ابتدا کی تاریخ قلم بند کرنے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ ابتدائی دور کی زبان کے کافی نمونوں کی عدم دستیابی کا ہے۔ نئی زبان ابتدائی مرحلے میں بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔ شعروادب کی تخلیق اور تصنیف وتالیف کا مرحلہ بعد کو آتا ہے۔ اردو کے جو قدیم ادبی نمونے دستیاب ہیں وہ پندرہویں صدی عیسوی سے پہلے کے نہیں ہیں۔ لسانی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ادبی نمونوں کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان کے نمونے بھی قدر و اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری زبان جب بول چال کے مرحلے میں تھی اور شرفا یا اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس زبان کو حقیر سمجھتے تھے، صوفیاے کرام نے اس زبان کو ہم کلامی کے لیے استعمال کیا۔ حالاں کہ بیش تر صوفیا عربی و فارسی بولنے والے تھے، اس صورت حال میں صوفیا کی زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ جہاں ہماری زبان کے ابتدائی لسانی نمونے فراہم کرتے ہیں وہیں یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ صوفیا نے اردو کے چلن میں اور ملک کے دور دراز علاقوں تک زبان کو پہنچانے میں غیر معمولی اور نا قابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔

4.2 صوفیانہ مسلک اور صوفی کا مفہوم:

صوفیانہ مسلک، مذاہب کی روح یعنی روحانیت یا باطنیت پر قائم ہے۔ شریعت یا مذہبی احکام کا ظاہری پہلو عبادت کے طریقوں میں نظر آتا ہے جب کہ باطن یا نیت و ارادہ کی درستگی کے بغیر مذہب یا شریعت کی پابندی بے معنی ہے۔ صوفیانہ مسلک ظاہری رسم و رواج کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ باطنیت اور روحانیت پر زور دیتا ہے۔ اس مسلک کو اپنانے والا صوفی کہلاتا ہے۔ لفظ صوفی صوف یا صفات سے بنا ہے۔ دونوں صورتوں میں صوفیت کا مفہوم روحانی ترقی اور قلب کی پاکیزگی ہے جو اکثر صورتوں میں شریعت کے احکام کی ظاہرداری میں کھو جاتی ہے۔ صوفیوں نے پاکیزگی قلب اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے جو اصول بنائے ہیں وہ طریقت سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ اس مسلک کا پہلا سبق حقیقت یا خدا کی شناسائی کا ہے۔ حقیقت ازلی یا خدا کے جلوے انسان کی ذات اور کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انسان اور کائنات کے وجود پر غور کر کے حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ صوفیانہ مسلک ظاہرداری کے ساتھ ساتھ دنیاداری کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ صوفیوں کی نظر میں فقیر اور بادشاہ ایک جیسا ہے۔ صوفیا عظمت آدم کے قائل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی درگاہیں بلا تفریق مذہب وملت ہر طرح کے لوگوں کے لیے کھلی ہوتی ہیں۔ وہاں امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ، فقیر ہر ایک کی رسائی ہے۔ اگر حکمراں اور بادشاہ جان و مال پر حکومت کرتا ہے تو صوفی دلوں کو قبضے میں لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کے سامنے امرا اور جاہ وجلال والے بادشاہ بھی سر جھکا دیتے ہیں۔

4.2.1 صوفی کی حیثیت مولوی عبدالحق کی نگاہ میں:

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے صوفیوں کے کارناموں پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''۔ اس رسالہ میں انھوں نے مولوی اور صوفی کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولوی ظاہر کو اور صوفی باطن کو دیکھتا ہے۔ مولوی کی نظر برائی پر پڑتی ہے اور صوفی برائی میں بھی بھلائی کا کوئی پہلو ڈھونڈ لیتا ہے۔ مولوی سختی برتتا ہے تو صوفی نرمی و ملائمت اور عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔ مولوی کے پاس علم زیادہ ہوتا ہے جب کہ صوفی کے پاس عمل کی قوت ہوتی ہے۔ مزید لکھا ہے کہ:

> ''مولوی سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے لیکن صوفی ہر ایک کے الگ طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی طبیعت کی افتاد ہوتی ہے اسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے اور اس میں بعض اوقات وہ شریعت سے تجاوز کرنے اور بعض ارکان کے ترک کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کرتا۔ اس کی نظر انجام پر رہتی ہے۔ وہ مولوی کی طرح لفظ کا بندہ نہیں بلکہ معنی کو دیکھتا ہے۔ اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے اور باوجود یکہ وہ دنیا سے ایک گونہ بے تعلق اور مولوی اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ دنیادار ہوتا ہے، مگر وہ علما کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہنچتا ہے جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے۔ مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، اس میں صوفی کی جیت ہے۔ اس کے بعد وہ نفس کی چوریاں اس آسانی، خوش اسلوبی اور لطف سے پکڑتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے کہ بعض اوقات مرید کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی۔ اس کا سب سے بڑا اور مقدم اصول دلوں کا ہاتھ میں لانا ہے اور اس مقصد کے حصول میں وہ کسی ظاہری رُکاوٹ کی، خواہ شرعی ہو یا غیر شرعی، پرواہ نہیں کرتا اور سب کو توڑ کے رکھ دیتا ہے اور صحیح بھی ہے، جب دل ہاتھ میں آ گیا تو گویا سب کچھ مل گیا۔''

4.3 ہندوستان میں صوفیوں کی آمد اور ان کے سماجی روابط:

ہندوستان میں صوفیوں کی آمد مذہب و اخلاق اور روحانیت کی تعلیم و تبلیغ کی غرض سے ہوئی۔ انھوں نے دشوار گزار اور پُرخطر راستے طے کر کے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا۔ یہاں کی زبان، رہن سہن کے طریقے، کھان پان، لباس و پوشاک اور آب و ہوا تک ان کے لیے اجنبی اور نامانوس تھی۔ پھر انھوں نے مذہب و اخلاق کی تبلیغ اور روحانیت کی تعلیم عام کرنے کے

لیے یہاں سکونت اختیار کی اور عوام میں ایسے گھل مل گئے کہ وہ مرجع خلائق بن گئے۔ انھوں نے انسانیت سے سروکار رکھا تھا اور دلوں کو مسخر کیا گیا، اس لیے وہ بزرگ جہاں بھی آرام فرمائیں، خلق خدا کا ہجوم ان کے آستانوں پر آج بھی پیشانیاں رگڑتا ہے۔

صوفیا نے مذہب وملت اور خاص و عام کی تفریق و امتیاز کے بغیر ہر طبقہ کے لوگوں سے رابطہ رکھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے قابل ذکر کام یہ بھی کیا کہ عوام سے ان ہی کی بولی میں بات کی۔ اگر چہ صوفیا یہاں کی بولیوں سے آشنا نہ تھے، لیکن انھوں نے عوامی رابطے کی خاطر اپنی زبان کے بجائے عوام کی زبان کا بول چال کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح جہاں انھوں نے مذہب و اخلاق اور روحانیت کا پیغام عام کیا وہیں بالواسطہ طور پر زبان کو بھی فائدہ پہنچایا۔

4.4 صوفیا کے ناقابل فراموش کارنامے:

صوفیاے کرام کے جو اقوال، ملفوظات اور نثر و نظم میں رسالے یا تصانیف ہم تک پہنچی ہیں وہ مریدوں کی رشد و ہدایت کے لیے تھیں۔ ان کا مقصد زبان کی ترقی یا ادبی تخلیق پیش کرنا نہیں تھا۔ پھر بھی صوفیا کے فیوض و برکات سے زبان کو بھی فائدہ پہنچا۔ دوسری طرف مذہب رواداری، اشتراک و اتحاد اور انسان دوستی کی ایسی بے مثال روایت قائم ہوئی جسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ مفتی شوکت علی فہمی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے کہ اولیاے کرام نے اس برعظیم کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر انسانیت کی وہ قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس کی مثال اس ملک کی تاریخ میں مفقود ہے۔ ان مقدس بزرگوں نے بے کسوں اور بے بسوں کو شہنشاہیت کے اس پنجہ سے بچانے میں نمایاں حصہ لیا ہے جس کے بوجھ تلے انسانیت بری طرح کچلی جارہی تھی۔.....اولیاے کرام کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے کہ ان کی ہمدردیاں کسی خاص مذہب یا ملت کے لیے محدود نہ تھیں بلکہ وہ ہر نبی نوع انسان کے لیے ابر رحمت بن کر آئے تھے۔ چنانچہ اس برعظیم کی ہر قوم اور ہر ملت نے بلا امتیاز مذہب و ملت ان اولیاے کرام کے صوفیوں سے یکساں فائدہ اٹھایا ہے۔''

صوفیا نے مریدن کے سوالوں کے جواب میں یا روزمرہ کی گفتگو میں مقامی الفاظ استعمال کیے۔ وہ صوفیا جو شاعر تھے اور سماع کا ذوق رکھتے تھے، ان کے دوہرے یا اشعار و ابیات بھی اسی مقامی عوامی زبان میں ہیں۔ معرفت و سلوک کے موضوع پر صوفیا نے جو رسالے سوال و جواب کے انداز میں لکھے ہیں ان میں بھی ہندی کا استعمال ہوا ہے۔ انھوں نے حتی الامکان عربی، فارسی الفاظ کے استعمال سے گریز کیا۔ تصوف کے نکات کی وضاحت کے لیے ہندو دیومالائی تلمیحیں اور استعارے بھی استعمال کیے۔ ہندی بحروں اور اوزان کو اختیار کرنے میں بھی انھوں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ اکثر یہ بھی

نظر آتا ہے کہ مقامی اور عام فہم الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت کے پیش نظر عروض اور قافیہ کے اصولوں کی بھی پروانہیں کرتے تھے۔ یہ سب محض اس لیے تھا کہ مریدوں تک پیغام آسانی سے پہنچ جائے اور خاص و عام کے لیے زبان کا مسئلہ حائل نہ ہو۔ جس طرح انھوں نے بلا امتیاز مذہب وملت اہل ہند سے میل جول اور ربط وتعلق بڑھا کر مذہبی رواداری کی مثال قائم کی اسی طرح زبان کے معاملے میں بھی اختلاط سے کام لے کر اس عوامی زبان کو رائج کیا جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

4.5 صوفیا کے اقوال اور کلام کی تاریخی اور لسانی اہمیت:

صوفیا کے جو آثار، اقوال وملفوظات یا شعری ونثری رسالوں کی شکل میں موجود ہیں، تاریخ زبان کے مطالعہ میں ان کی بنیادی اہمیت ہے۔ اگر چہ ابتدائی دور کے کئی صوفیا کے آثار ہم تک نہیں پہنچے، پھر بھی جو کچھ محفوظ رہا وہ اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔

صوفیا کے اقوال وملفوظات اور شعری ونثری تحریروں کی اہمیت دو وجہوں سے ہے: اوّل اردو زبان کی تشکیل کے دور میں زبان کو رواج دینے اور ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچانے کے سبب۔ ہمیں معلوم ہے کہ اردو کی جائے پیدائش دہلی اور نواح دہلی ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی کی اردو کے جو نمونے ہمیں ملتے ہیں وہ صوفیا کے اقوال وملفوظات پر مبنی ہیں۔ دہلی سے ابتدائی اردو کا پودا خلجیوں اور تغلقوں سے پہلے ہی صوفیا کے ذریعہ دکن پہنچا اور بار آور ہوا۔ نومولود زبان ہونے اور فارسی کی حکمرانی کے سبب شرفا اس زبان کو تصنیف وتالیف کے لیے استعمال کرنا باعث عار سمجھتے تھے۔ صوفیا نے اس نومولود زبان کو ہم کلامی کے لیے استعمال کر کے اور اس میں تصنیف وتالیف کا نمونہ پیش کر کے شرفا اور اہل علم کو اس زبان کی طرف متوجہ کیا۔ بقول مولوی عبدالحق:

> ''ہندی یا اس نومولود زبان میں لکھنا اہل علم اپنے لیے باعث عار سمجھتے تھے اور وہ اپنی عالمانہ تصانیف کو اس حقیر اور بازاری زبان کے استعمال سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ صوفی ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے جرأت کی اور اس کفر کو توڑا۔ اصل صوفی ظاہری ننگ وعار سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس نے پھر ایک بار یہ دکھا دیا کہ حقیر سے حقیر چیز سے بھی کیسے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ یہ صوفیوں ہی کی جرأت کا فیض تھا کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی جو پہلے ہچکچاتے تھے، اس کا استعمال شعروسخن، مذہب وتعلیم اور علم وحکمت کے اغراض کے لیے شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیاے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔''

صوفیا کے ملفوظات اور تحریروں کی دوسری بڑی اہمیت اردو کے لسانی ارتقا کو سمجھنے کے سلسلے میں، قدیم اردو کے وافر لسانی نمونوں کی عدم دستیابی ماہرین لسانیات کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ صوفیا کے آثار قدیم اردو کے واحد لسانی نمونے

کے طور پر غنیمت شمار کیے جاتے ہیں۔ اپ بھرنش کی جکڑ بندیوں سے باہر نکل کر ابتدائی اردو کی کیا شکل وصورت رہی، تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی کے دوران قدیم اردو میں کیا تغیرات ہوئے، دکن اور گجرات کی اردو کے نمونے کیا ہیں؟ تلفظ، املا، سرمایہ الفاظ اور صرفی ونحوی سطح پر ابتدائی اردو کی کیا صورت تھی؟ ایسے بہت سے سوالوں کا جواب صوفیا کے آثار میں ملتا ہے۔ اس طرح اردو کے لسانی ارتقا کی کڑیوں کو جوڑنے میں صوفیا کے اقوال وملفوظات اور تصانیف قدر واہمیت کی حامل ہیں۔

4.6 ابتدائی دور کے صوفیا کے احوال وآثار:

اردو کے ارتقا کی کڑیوں کو جوڑنے کے سلسلے میں محققین نے مختلف تاریخی کتابوں، تذکروں اور سوانحی کتب سے صوفیا کے اقوال وملفوظات اور احوال وآثار تلاش کیے ہیں۔ چوں کہ بہت سے آثار سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے اور بعد میں تحریری شکل میں جمع کیے گئے، اس لیے بعض آثار کے مستند ہونے پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ آثار اردو کی تشکیل کے مختلف مرحلوں کی نشان دہی کرنے میں بے حد معاون ہیں۔ اردو کے دہلوی یا ہندوی کے مرحلے سے گزر کر زبان کا درجہ اختیار کرنے تک کے بیش تر مرحلوں کی صورت حال کا اندازہ صوفیا کے باقیات وآثار کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ایسے اکابر صوفیا کے مختصر احوال اور اقوال درج ذیل ہیں:

4.6.1 حضرت فریدالدین گنج شکر:

حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر ملتان کے رہنے والے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید وخلیفہ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۱۷۳ء میں اور وفات ۱۲۶۵ء میں ہوئی۔ قیام پاک پٹن میں رہا۔ مادری زبان قدیم پنجابی تھی لیکن ہندی میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ آپ نے مریدوں سے گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ ''بھوگ'' لفظ کا استعمال کیا ہے۔ آپ کے ملفوظات میں ''پونوں کا چاند بھی بالا ہے'' مشہور اور مستند ہے۔ اگر چہ حضرت گنج شکر کی کوئی تصنیف وتالیف اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن مختلف حوالوں سے آپ کی شاعری کے نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ بطور مثال چند ایک درج ذیل ہیں:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک/پوک
پیش روا صفیا کے ہوتے غوک

.....

اساکیری یہی سوریت جاؤں جانائے کہ جاؤں مسیت
جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوے داس

.....

راول دیول مہے نہ جایئے		پھاٹا پہنا روکھا کھایئے

ہم درویشنہ رہے ریت		پانی لوریں اور مسیت

4.6.2 شیخ حمیدالدین ناگوری:

شیخ حمیدالدین ناگوری ولادت ۱۱۹۳ء، وفات ۱۲۷۴ء کا ذکر مولوی عبدالحق نے اپنے رسالہ میں اس طرح کیا ہے:

''خزانۂ رحمت میں لکھا ہے کہ ایک روز شیخ حمیدالدینؒ فقر و فاقہ سے تنگ آ کر اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اپنے فرزند کے حق میں فراخی معاش کے لیے دعا کیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ ماں اپنے فرزند کے حق میں فراخیِ معاش نہیں چاہتی۔ اگر تم فراخیِ معاش چاہتے ہو تو اپنے باپ سے کہو۔ چنانچہ یہ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی عرض کی۔ فرمایا ''ہاں بابا کچھ کچھ'' انھوں نے ماں کے پاس حاضر ہو کر کہا کہ حضرت والد نے یہ فرمایا ہے۔ والدہ نے کہا بابا تم اپنا گھر الگ بنالو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے، اتنی دولت آئے گی کہ سمیٹے نہ سمٹے گی۔

کچھ دن کے بعد سلطان نے پیغام بھیجا کہ صاحب زادہ کو ہمارے پاس بھیج دیجیے ہم اس کا عقد اپنی بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے بیٹے کو اجازت دے دی۔ عقد کے بعد دلہن اتنی دولت مال و اسباب لائی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ والدہ نے بیٹے سے کہا کہ اچھا ہوا کہ کچھ کچھ کہا، اگر کچھ زیادہ کہتے تو نہ معلوم کیا ہوتا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ان بزرگوں کے گھروں میں بھی ہندی بول چال کا رواج تھا اور چوں کہ یہ ان کے مفید مطلب تھا اس لیے وہ اپنی تعلیم و تلقین میں بھی اسی سے کام لیتے تھے۔

اس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ زبان جسے ہندی کہتے تھے اور جو باوجود تغیر و تبدل کے کچھ مدت قبل تک ہندی کہلاتی رہی ہے اور اب اردو کے نام سے موسوم ہے کس طرح ہمارے ملک میں اندر باہر چھائی ہوئی تھی۔''

4.6.3 شیخ شرف الدین بوعلی قلندر:

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کے والد محترم عراق کے تھے۔ آپ کا تعلق پانی پت سے تھا۔ آپ کی ولادت کا سن نامعلوم ہے۔ سال وفات ۱۳۲۳ء ہے۔ علاء الدین خلجی نے حضرت امیر خسرو کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ آپ نے حضرت امیر خسرو کو اپنا کلام سنایا اور ان سے پوچھا کہ ''ترکا کچھ سمجھ دا ہے'' شیخ کے مبارز خاں کے ارادہ سفر کے موقع پر ایک

شعر کہا تھا جو اس طرح ہے:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

4.6.4 حضرت امیر خسرو:

حضرت ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو (۱۲۳۶ء۔۱۳۲۴ء) حضرت نظام الدین اولیا کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ آپ ایک بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ننانوے کے قریب بتائی جاتی ہے جن میں سے بہت سی نایاب ہیں۔ خسرو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے فارسی کلام میں ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ موسیقی اور ادب میں آپ کی ایجادات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کچھ خاص قسم کے گیت اور ریختہ کے موجد امیر خسرو ہیں۔ ماہر موسیقی کے طور پر ستار اور موسیقی کی بہت سی راگ راگنیاں آپ کی ایجاد ہیں۔ امیر خسرو قدیم اردو کے ایک بڑے اور اہم مصنف ہیں جن کے ہندی آثار وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

امیر خسرو نے ماہر زبان کے طور پر اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی ایک فہرست بھی یادگار چھوڑی ہے جو ماہرین لسانیات کے لیے بیش قیمت مواد ہے۔ انھوں نے اپنی زبان کو دہلوی کہا ہے۔ ان کے فارسی کلام میں جو ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ تو قدر و اہمیت رکھتے ہی ہیں۔ ان کا ہندی کلام بھی تاریخ زبان کے ماہرین کو راہ دکھاتا ہے۔ امیر خسرو کے نام سے منسوب بہت کلام مستند نہیں مانا جاتا پھر بھی ان کے ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کے ہندی کلام میں ریختہ، دوہے، پہیلیاں، کہ مکرنیاں، انمل، دوسخنے، ڈھکوسلے وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم جاں! نہ کاہے لیہو لگائے چھتیاں

.....

گوری سودے سیج پرمکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چودیس

.....

بالا تھا جب من کو بھایا		بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہ دیا اس کا ناؤں		بوجھے نہیں تو چھوڑے گاؤں

(دیا)

دس ناری ایک ہی نر		بستی باہروا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم		منھ میٹھا تاثیر گرم

(خربوزہ)

زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کو سمجھنے میں صوفیا کے اقوال اور کلام کس قدر اہمیت رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان لسانی مطالعوں سے ہوتا ہے جو امیر خسرو کے ہندوی کلام کی بنیاد پر کیے گئے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے خسرو کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں تین قسم کی زبان کا استعمال ہوا ہے: ٹھیٹھ کھڑی بولی، کھڑی اور برج بھاشا ملی جلی اور خالص برج بھاشا۔ گیتوں میں انھوں نے برج بھاشا سے کام لیا ہے جب کہ پہیلیوں اور کہ مکرنیوں وغیرہ میں خالص کھڑی یا کھڑی اور برج ملی ہوئی زبان کا نمونہ پیش کیا ہے۔

اسی طرح کا تجزیہ کرتے ہوئے گیان چند نے عہد خسرو کی زبان دہلی کو ''ماقبل کھڑی بولی'' اور آگرے کی زبان کو ''ماقبل برج بھاشا'' قرار دیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق چوں کہ خسرو کی جاے پیدایش برج علاقے کی ہے اور بیش تر عمر دلّی میں گزری، اس لیے خسرو کے کلام میں ماقبل کھڑی اور برج کی ملاوٹ دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ برج کے بہ مقابلہ خسرو کے یہاں کھڑی کے اثرات زیادہ ہیں اور بقول گیان چند: ''خسرو نے پہلی بار اس میں شعر کہہ کر کھڑی بولی کے ارتقا میں بڑی مدد دی۔''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول:

> ''امیر خسرو کی ہندی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ جب ہم امیر خسرو کی ہندوی شاعر کی بات کرتے ہیں تو اس سے آج کی معیاری ہندی یا آج کی معیاری اردو مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے وہ پرانی زبان مراد ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں قدیم برج بھاشا یا کھڑی بولی کا وہ روپ تھی جو آگے چل کر رفتہ رفتہ معیاری درجہ اختیار کر گیا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے امیر خسرو کے کلام کی بنیاد پر مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''ان کے کلام کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ اب یہ زبان قدیم اپ بھرنش کے دائرے سے باہر نکل آئی ہے اور دہلی و اطراف دہلی کی زبانوں سے مل کر اپنی تشکیل کے ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے جس پر کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں اثر انداز ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اب دھل منج کر اتنی صاف ہوگئی ہے کہ اس میں شاعری کی جا سکے۔''

4.6.5 شیخ لطیف الدین دریانوش:

شیخ لطیف الدین دریانوش حضرت نظام الدین اولیا کے خلفا میں سے تھے۔ ولادت و وفات کا سال نا معلوم ہے۔ البتہ حضرت نظام الدین اولیا کے وصال کے وقت آپ حیات سے تھے جو ساتویں صدی ہجری کا زمانہ ہے۔ آپ دہلی میں پائی جانے والی سرکی سے بنے مکان میں رہتے تھے۔ جب یہ خستہ ہوکر آندھیوں میں اڑنے لگتی تو پھر دوسری سرکی لے آتے۔ جب کوئی یہ پوچھتا کہ گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو جواب میں فرماتے:

آرے آرے بابا ہمے بنجارے
کیا گھر کرتے ہیں بنجارے

4.6.6 : شیخ شرف الدین یحییٰ منیری:

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا تعلق بہار سے تھا۔ سن ولادت ۱۲۶۳ء اور سن وفات ۱۳۷۰ء ہے۔ ان کے بتائے ہوئے منتر سانپ بچھو کے زہر اتارنے اور جھاڑ پھونک کے لیے استعمال میں لائے جاتے رہے ہیں۔ شیخ کے منتروں کے علاوہ ان کے بعض دوہروں سے اس عہد کی پوربی بولی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

کالا ہنسا نہ ملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے یکہ ہرے نرمل کرے سریر

دردر ہے نہ پیڑ
شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے
گرد چھوٹیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

4.6.7 ابتدائی دور کے صوفیا کے چند اور اقوال:

حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی نے شیخ سراج الدین عثمان اخی سے ایک موقع پر کہا: ''تم اوپر وہ تل'' یہ قول چودھویں صدی عیسوی کی زبان کا نمونہ ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا کی پیرزادی یعنی بابا فرید شکر گنج کی صاحب زادی بی بی عائشہ نے حضرت شاہ برہان الدین غریب سے ایک موقع پر کہا: ''اے برہان الدین! ساڈی دھیہ کہ کہیا ہنسدا ہے؟'' یعنی اے برہان الدین تو ہماری لڑکی کو دیکھ کر کیوں ہنستا ہے؟

4.7 دکن و گجرات اور دیگر علاقوں کے بعض صوفیا کے احوال و آثار:

اردو کا کونپل اگرچہ شمالی ہند میں پھوٹا لیکن اس کا پودا دکن و گجرات میں لہلہایا۔ خلجی اور تغلق بادشاہوں نے دکن کے بڑے حصے کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ شمال کی بڑی آبادی دکن و گجرات پہنچی۔ دلّی کو نومولود زبان نے اپنی ابتدائی نشو ونما کا

ساڑھے تین سو سالہ دور دکن و گجرات میں پورا کیا۔ اس علاقے میں شمال کی دہلوی، ہندوی یا ہندی دکنی اور گجری کہلائی۔ اس سلسلے کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ دکن و گجرات میں شمالی ہند کی زبان مسلم فاتحوں سے پہلے ہی روحانی فاتحین کے ذریعہ پہنچ چکی تھی۔ ایسے روحانی فاتحین یا صوفیوں میں حاجی روحی، سید شہاب الدین، سید شاہ مومن، بابا سید مظہر عالم، شاہ جلال الدین گنج رواں، حیات قلندر، بابا شرف الدین وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان بزرگوں کے ہندی اقوال دستیاب نہیں ہیں، لیکن انھوں نے کئی زبان کے لیے زمین تیار کرنے کا کام کیا۔ بہمنی دور میں شاہ برہان الدین غریب، شیخ عین الدین گنج العلم، میراں جی شمس العشاق، گیسو دراز، امیر حسن سنجری، زین الدین خلد آبادی وغیرہ دکن آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ دکن کے بہت سے صوفیا کے اقوال و ملفوظات اور نثر و نظم میں ان کی تصانیف دستیاب ہیں۔ آئندہ سطروں میں دکن و گجرات کے صوفیا کے کارناموں پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔

4.7.1 حضرت گیسو دراز بندہ نواز:

حضرت بندہ نواز کا نام سید محمد اور لقب گیسو دراز تھا۔ آپ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ و مرید تھے۔ ۱۳۹۸ء میں اپنے بہت سے مریدوں کے ساتھ حضرت بندہ نواز گلبرگہ (صوبہ کرناٹک) پہنچے اور بقیہ زندگی یہیں بسر کی۔ آپ کی کئی نثری تصانیف اور شعر گوئی کا ثبوت موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے آپ کا نمونۂ کلام درج کیا ہے جو یہ ہے:

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائے جیو کا گھونگھٹ کھول کر پیا مکہ آپ دکھائے
رکھے سید محمد حسینی پیو سنکھ کھیان جائے

4.7.2 حضرت قطب عالم و حضرت شاہ عالم:

پندرہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں گجرات سے تعلق رکھنے والے جن صوفیا کے اقوال و ملفوظات دستیاب ہیں ان میں حضرت قطب عالم اور ان کے فرزند و خلیفہ حضرت شاہ عالم خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ حضرت قطب عالم ایک شب تہجد کے لیے بیدار ہوئے، آنگن میں رکھی ہوئی کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو فرمایا: ''ابے چھوکرا، بے ادبی بگزارد گستاخی مکن'' مشہور و معلوم ہے۔ صوفیا کے ان لسانی نمونوں کی بنیاد پر سید ظہیر الدین مدنی نے گجرات و دکن میں اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''معلوم ہوتا ہے چودھویں صدی تک یہ بولی قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی تھی۔ گجری سے متعلق اس صدی کی معلومات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ پندرہویں صدی کے نصف اوّل سے بزرگوں کے جو اقوال اور فقرے ملتے ہیں ان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ بولی بہت پہلے منھ چڑھ چکی تھی۔''

4.7.3 سید محمد جونپوری:

سید محمد جونپوری پندرہویں صدی کے ایک بڑے بزرگ تھے۔آپ کی ولادت ۱۴۴۳ء میں اور وفات ۱۵۰۴ء میں بلوچستان میں ہوئی۔مولوی عبدالحق نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ باوجود علم وفضل کے اکثر ہندی یا گجراتی میں گفتگو کرتے تھے۔آپ کے بعض اقوال یہ ہیں:''روپیٹنے خدا کوں پونچے۔''اور''شہ کی چوٹ شکر کی پوٹ۔''

4.7.4 شیخ بہاءالدین باجن:

شیخ بہاءالدین باجن (۱۳۸۸۔۱۵۰۶ء) کا تعلق برہان پور سے تھا۔سید ظہیرالدین مدنی کے بقول گجرات میں مستقل تصانیف کا آغاز شیخ کی تصنیف''خزانۂ رحمت'' سے ہوتا ہے جس میں آپ کی مکرنیاں اور دوہے شامل ہیں۔آپ کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

باجن جسے کسی کے عیب ڈھانپے		اس تھی درجن تھرتھر کانپے
اللہ سیتی جسے کوئی ہوئے		اللہ اور جگ اس کا ہوئے

4.7.5 شیخ عبدالقدوس گنگوہی:

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵ء۔۱۵۳۸ء) نے تصوف سے متعلق ایک کتاب''رشدنامہ'' تحریر کیا تھا۔آپ نے مقامی زبان میں دوہے بھی لکھے ہیں۔الکھ داس تخلص کرتے تھے۔رشدنامہ میں ان کے کلام کا کافی نمونہ موجود ہے۔مثلاً:

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں نہ ہور نکوئے
دیکھا بوجھ بچار میں سبھّی آپیں سوئے

4.7.6 شاہ محمد غوث گوالیاری:

شاہ محمد غوث گوالیاری ایک عظیم المرتبت صوفی بزرگ تھے۔آپ کا ایک قول مولوی عبدالحق نے نقل کیا ہے:''بھیکی بچہ خدا کو نہ میلے''یعنی بھکاری کو(؟)نہیں ملتا۔آپ کی وفات ۱۵۶۲ء میں ہوئی۔

4.7.7 شیخ علی متقی:

شیخ علی متقی،شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پیرومرشد تھے۔سال ولادت ۱۴۸۰ء اور سال وفات ۱۵۶۷ء ہے۔شیخ عبدالحق نے اخبارالاخیار میں آپ کا یہ دوہرہ درج کیا ہے:

سن سہیلی پریم کی باتا
یوں مل رہی جوں دودھ بناتا

4.7.8 شیخ وجیہ الدین احمد علوی:

شیخ وجیہ الدین احمد علوی سولہویں صدی عیسوی کے بڑے عالم اور صاحب باطن رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا آخری دور احمد آباد میں تعلیم و تدریس میں صَرف کیا۔ ''بحر الحقائق'' نامی کتاب میں آپ کے ملفوظات ملتے ہیں۔ آپ کے مرید آپ سے فارسی میں سوال کرتے تھے اور آپ ہندی میں جواب دیتے تھے۔ مثلاً: جس چیز میں ذوق وشوق پاوے اسے ترک نہ دیوے۔''

''کاہے دنیادار بھی اپنچ''، ''جیسی تجلی پکڑے تیسا ارادہ دیوے، اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے۔''

4.7.9 قاضی محمود دریائی:

قاضی محمود دریائی گجرات کے بڑے اولیا اللہ میں سے ہیں۔ آپ کی زندگی بیر پور اور احمد آباد میں گزری۔ ۱۵۳۴ء میں وصال فرمایا۔ آپ کا صوفیانہ کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ سماع اور موسیقی میں دلچسپی تھی۔ ہر نظم کے شروع میں راگ راگنی کا نام بھی درج کیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

نینوں کا جل مکھ تینو لاناک موتی گل ہار
سیس نماؤں نیہہ اپاؤں اپنے پیر کروں جوہار

یعنی آنکھوں میں کاجل، منھ میں پان، ناک میں موتی، گلے میں ہار۔ اس سج دھج سے میں سر جھکاؤں، محبت کروں اور اپنے اپنے پیر کو آداب کروں۔ (بحوالہ مولوی عبدالحق)

4.7.10 شاہ علی محمد جیو گام دھنی:

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجری ادب کے چار ستونوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۵۶۵ء میں الہ آباد میں ہوا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ ''جواہر اسرار اللہ'' کے نام سے موجود ہے۔ جیو گام دھنی بلند پایہ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ سارا کلام تصوف کے مسائل بطور خاص وحدت الوجود کے نظریہ کا ترجمان ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

کبھی سو ہوئے اندھیاری راتا
سانج ہی کر لاوے دھاتا
ہوکر دیورا راتیں ساری
لاکر جوت دکھاوے ساری

4.7.11 خوب محمد چشتی:

گجری ادب کے چوتھے بڑے ستون خوب محمد چشتی، احمد آباد کے اکابر صوفیوں اور جید سخن وروں میں سے تھے۔

سال ولادت ۱۵۳۹ء اور سال وفات ۱۶۱۴ء ہے۔ ''خوب ترنگ'' کے نام سے آپ کی کتاب تصوف کے موضوع پر ہے۔ دوسری کتاب ''چھند چھندوں'' عروض سے متعلق ہے اور تیسری کتاب ''بھید بھاؤ'' صنائع و بدائع سے متعلق ہے۔ یہ کتابیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انھوں نے بولی کو زبان کے مرتبے ک پہنچایا۔ سترہویں صدی آتے آتے زبان ادبی اظہار کا وسیلہ بنی اور حسن بیان پر توجہ دی جانے لگی۔ اگر دکن کے شاہ میران جی اور ان کے فرزند برہان الدین جانم ہندی لکھنے کی معذرت کررہے ہیں تو گجرات کے خوب محمد چشتی اپنی زبان کو عرب وعجم کے حسن کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً:

جیوں میری بولی منھ بات		عرب عجم مل ایک سنگات
جیوں دل عرب عجم کی بات		سن لو لے بولی گجرات

4.7.12 شمس العشاق شاہ میراں جی:

دکن سے تعلق رکھنے والے صوفیا میں شاہ میراں جی کئی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت مکہ میں ہوئی۔ رشد و ہدایت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور میں مقیم ہوئے۔ شاہ میراں جی صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ نظم ونثر میں آپ کے کئی رسالے دستیاب ہیں۔ آپ کے فرزند شاہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلی بھی بلند پایہ صوفی اور صاحب قلم ہوئے۔

شاہ میراں جی پندرہویں صدی عیسوی کے برگزیدہ صوفی بزرگ تھے۔ آپ کا روحانی سلسلہ حضرت گیسودراز سے جاملتا ہے۔ مادری زبان عربی ہونے کے باوجود آپ نے اس دور کی ہندوستانی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ حضرت گیسودراز دہلی سے جو زبان دکن لائے تھے اس کو میراں جی اور ان کے خانوادے کے دوسرے بزرگوں نے تصنیف و تالیف کے لیے استعمال کرکے اس کی ترقی کی راہ کھول دی۔ بقول عبدالحق: ''کیا یہ کچھ کم کرامات ہے کہ ایک شخص جو مکہ میں پیدا ہوتا ہے، ہند میں آکر یہیں کی زبان میں تعلیم وتلقین حاصل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی میں لکھتا پڑھتا اور اسی میں نغمہ سرا ہوتا ہے۔''

سلوک ومعرفت پر شاہ میراں جی کے منظوم رسالوں میں شہادت الحقیقت، خوش نامہ اور نثر میں شرح مرغوب القلوب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

توں قادر کر سب جگہ سب کوں روزی دیوے
توں سبھوں کا دانا بنیا سب جگ تجکوں سیوے
سب کی چنتا تجکوں لاگی جیسے جیو جیون
سب کی جان سجاں تو نہیں دے جے جے جس کے من

ایک ماٹی مولی دیوے ایکس ماٹی باج
کیتوں بھیک منگاوے کیتوں دیوے تاج

نثری رسالہ شرح مرغوب القلوب کی زبان کا نمونہ ہے:

''خدکہیا تحقیق مال اور پنگڑے تمہارے دشمن ہیں، چھوڑ دیو دشمنان کوں۔ اے کیسا غفلت ہے جو تجھے اندھا کیا موت کی یاد تھی تجھے بسرا کر۔''

4.7.13 شاہ برہان الدین جانم:

شاہ برہان الدین جانم شاہ میراں جی کے فرزند وخلیفہ تھے۔ آپ نے ایک بڑے شعری ذخیرے کے علاوہ کئی نثری رسالے یادگار چھوڑے ہیں جن میں کلمۃ الحقائق قابل ذکر ہے۔ اردو نثر کے قدیم ترین مستند نمونے کے طور پر کلمۃ الحقائق کو خاص اہمیت ہے۔ اگر چہ کلمۃ الحقائق کی نثر میں تسلسل اور روانی کی کمی ہے پھر بھی نثر کے اوّلین نمونے کے طور پر کلمۃ الحقائق اردو نثر کی تاریخ کا سنگ میل ہے۔ سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ: ''برہان الدین جانم کی نثر میں ترسیل کی بعض کوتاہیوں کے باوجود انشا کے بعض محاسن کی جھلک کہیں کہیں ضرور نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مصنف کے سامنے نثر کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں تھا جو اس کی رہبری کر سکتا۔''

شاہ برہان الدین جانم سے پہلے نثر کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ملفوظات واقوال کی شکل میں ہیں۔ کلمۃ الحقائق ایک مستقل نثری رسالہ ہے اور کسی حد تک ضخیم بھی۔ اس رسالے سے دکن میں اردو کے ارتقا کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شاہ جانم نے بھی اپنے والد شاہ میراں جی کی طرح ہندی میں لکھنے کے لیے معذرت کا اظہار کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں تصنیف وتالیف کے لیے ہندی یا قدیم اردو کا استعمال معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے کلمۃ الحقائق کو اردو نثر کے ارتقا کی ایک بنیادی کڑی قرار دیا جاتا ہے۔ بقول حسینی شاہد: ''وجہی ہوں یا امین الدین اعلی، دونوں نے جانم ہی کی شمع سے اپنی شمع روشن کی ہے اور اس اعتبار سے اردو کے نثری اسلوب کی داغ بیل ڈالنے میں کلمۃ الحقائق کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

4.7.14 شاہ امین الدین اعلی:

شاہ امین الدین اعلی سترہویں صدی میں بیجاپور سے تعلق رکھنے والے دکن کے عظیم المرتبت صوفی اور صاحب قلم رہے ہیں۔ آپ نے اپنے والد شاہ برہان الدین جانم اور اپنے دادا شاہ میراں جی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رشد وہدایت کے لیے نثر ونظم میں بہت سے متصوفانہ رسالے تحریر کیے۔ آپ کا قابل ذکر تحریری سرمایہ نثری رسالوں کی شکل میں ہے۔ یہ رسالے گنج مخفی، رسالہ وجودیہ، گفتار امین الدین، ظاہر وباطن، عشق نامہ، شرح کلمہ طیب اور کلمۃ الاسرار کے نام سے ہم تک

پہنچے ہیں۔ان رسائل میں تصوف کے مسائل، استعارہ اور تمثیل کے پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔زبان پر قدامت کا اثر ہے۔زبان منجھی اور دُھلی نہیں ہے، تشکیل کے دور سے گزر رہی ہے۔اس کے باوجود ان رسالوں میں فلسفیانہ مسائل اور تصوف کی اصطلاحوں کو اس ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے کہ تاریخ زبان کا مورخ ان سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔مثال کے طور پر کلمۃ الاسرار میں مندرجہ ذیل عبارت میں وجود وعدم کے مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''ارے بھائی لا کہتے ہیں نہیں کوئی اور نہیں کہا ہے او سے سمجھنا بھی کہ لوکاں بولتے ہیں کہ اوّل عدم تھا سوا دس عدم سوں سب عالم وجود ہوا ہنوز نابود میں سوں سب جہاں بود میں آیا تو اتنا معلوم کرنا کہ جس شے میں سوں یوں سب عالم پیدا ہوا تو اوس شے کوں بابو وعدم کس وجہ جاننا۔ ارے بھائی چھلکا اچھا ہے تو اوس میں البتہ مغز نکلتا ہے اگر چھلکا نہ ہوئے تو مغز کہاں سوں باہر نکلے۔کسی بزرگ نے کیا خوب بولے ہیں اسے خوب سمجھنا:

اوّل کچھ نہ تھا وہ نرنکار تھا
دونوں جگ کا پیدا کرن ہار تھا''

امین الدین اعلی کی نثر تشبیہ، تمثیل، استعارہ، علامت، ربط وتسلسل، وضاحت وصراحت اور استدلال کی خوبیوں سے آراستہ ہے۔بقول سیدہ جعفر:''ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایات کو آگے بڑھایا اور اردو نثر کو اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جہاں اس کے منفرد خدوخال ابھر سکے اور اس کا مخصوص مزاج اور انفرادی آہنگ اور لب ولہجہ متعین ہو سکے۔''

4.7.15 سید میراں حسینی شاہ:

سید میراں حسینی شاہ یا میراں جی خدانما شاہ امین الدین اعلی کے مرید تھے۔سال وفات ۱۶۶۳ء ہے۔آپ نے تین نثری رسالے شرح تمہیدات ہمدانی، رسالہ وجودیہ اور رسالہ مرغوب القلوب یادگار چھوڑے ہیں۔ان میں تصوف کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ان رسالوں نے اردو نثر کی راہ متعین کرنے اور نثر کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا۔

4.8 کبیر داس:

صوفی سنت کبیر داس، پیدائش ۱۳۹۸ء، وفات ۱۵۱۸ء، کا نام اردو، ہندی اور ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں زریں حرفوں سے لکھا جاتا رہے گا۔کبیر کا کلام زبان کی صفائی، برجستگی اور تجربات زندگی کا نچوڑ ہونے کے سبب ہر خاص و عام کو متوجہ کرتا ہے۔کبیر بھگتی تحریک کے علم بردار تھے۔اگرچہ پورب کے تھے لیکن ان کی زبان کو پوربی نہیں کہا جاسکتا۔ان کا کلام ایک ایسی ملی جلی زبان کا نمونہ پیش کرتا ہے جو ہندوستان کے ہر علاقے میں آسانی سے سمجھی جاتی تھی۔مولوی عبدالحق

نے کبیر کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''تلسی داس اور ملک محمد جائسی کی زبان پرانی اور مردہ ہو جائے گی لیکن کبیر کا کلام ہمیشہ تازہ اور ہرا بھرا رہے گا۔ یہی وہ زبان تھی جو نویں اور دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے تقریباً ہر خطے میں بولی یا سمجھی جاتی تھی اور اسے ہندوستان کی عام زبان ہونے کا فخر حاصل تھا۔ حضرت کبیر نے جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب کو ایک کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح ان دونوں کی زبانوں کو بھی اپنے کلام میں بڑی خوبی سے ملا کر ایک کر دیا ہے۔ یہیں سے اردو یا ہندوستانی کی بنیاد شروع ہوتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کبیر اس زبان کے اوّلیں بانیوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی عام زبان کہلانے کی مستحق ہے۔''

کبیر کا کلام اردو کے ابتدائی لسانی نمونے فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے سیکولر کردار کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

کبیر یہ گھر پریم کا خالہ کا گھر نا ہیں
سیس اتارے ہاتھ سے سو بیٹھے گھر ما ہیں

.....

ہاڑ جلے جوں لاکڑی کیس جلے جوں گھاس
سب تن جلتا دیکھ کر بھیا کبیر اُداس

.....

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

.....

ماٹی کہے کمہار سے تو کیا روندے مونہہ
اک دن ایسا ہوئے گا میں رودوں گی توہ

.....

چلو چلو سب کوئی کہے موہی اندیشہ اور
صاحب سوں پرچا نہیں، جائیں گے کس ٹھور

4.9 صوفیا کے لسانی نمونوں کی نوعیت اور کیفیت:

اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما کے مختلف مراحل صوفیاے کرام کے مرہون منت ہیں۔صوفیا نے رشد و ہدایت کے سلسلے میں بالواسطہ طور پر زبان کو جو فائدہ پہنچایا وہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔بیش تر باہر آئے ہوئے اور عربی و فارسی بولنے والے صوفیا نے کئی سطح پر زبان کی سرپرستی کی۔عوامی، مقامی اور علاقائی زبان میں گفتگو کر کے، عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ کو عوام سے روشناس کرا کے، دہلی کے اطراف میں پیدا ہونے والی قدیم اردو زبان کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچا کر اور اس زبان کو تحریر اور تصنیف و تالیف کے لیے استعمال کر کے۔صوفیا کے یہ زریں کارنامے اردو کے ابتدائی دور کے تقریباً چار سو سال کو محیط ہیں۔صوفیا کے اقوال و ملفوظات اور نثر و نظم میں تشکیل پذیر اردو زبان کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔اردو زبان کا مورخ زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے صوفیا کے اقوال و ملفوظات اور تحریروں سے لسانی نمونے حاصل کرتا ہے۔صوفیا کی اس بے مثل خدمت کا اعتراف عبدالحق نے ایک رسالہ لکھ کر کیا۔ جمیل جالبی نے صوفیا کی لسانی جدوجہد کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ''زبان کا جنگل کاٹنے، بیان کے پُرخار راستوں کو صاف کرنے، صحراؤں اور دلدلوں میں راستہ بنانے کی ایک انتہائی کامیاب کوشش کی ہے۔'' فرید نے لکھا ہے: ''یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جارہا ہے اور ہزار دشواریوں سے راستہ بنایا جارہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔''

4.10 خلاصہ:

ہندوستان میں صوفیاے کرام کی روحانی خدمات آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔انھوں نے عوام سے رشتہ قائم کر کے بے مثال روحانی خدمات انجام دیں۔صوفیوں کی خانقاہیں مرجع خلائق رہی ہیں۔انھوں نے محبت اور انسانیت سے عوام کا دل جیتا اور دلوں پر حکومت کی۔زیادہ تر صوفیا باہر سے آئے تھے اور یہیں رچ بس گئے۔ان میں سے بیش تر عربی یا فارسی بولنے والے تھے اور ہندوستانی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔پھر بھی انھوں نے عوام سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر ہندوستان کی عوامی زبانوں کا سہارا لیا۔ان کے اس عمل سے اس دور کی عوامی زبانوں کو بھی فائدہ پہنچا۔صوفیوں کی خانقاہوں اور مرکزوں سے روحانی فیض کے ساتھ ساتھ لسانی فیض بھی جاری ہوا۔

اردو زبان کی تشکیل کے ابتدائی دور سے رابطے کی عوامی زبان بن جانے تک اس کی آبیاری صوفیاے کرام نے کی۔ صوفیا نے اردو زبان کو کئی طرح سے فائدہ پہنچایا۔انھوں نے عربی، فارسی اور ترکی کے ان الفاظ سے ہندوستانیوں کو آشنا کیا جو آگے چل کر اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بنے۔دوسرے، قدیم اردو کو جو کھڑی بولی پر قائم تھی، اپنے مذہبی مقاصد یعنی رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا۔تیسرے، اس نومولود زبان کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا۔چوتھے، اس زبان میں نثر و نظم کے رسالے اور کتابیں لکھ کر۔

یوں تو صوفیاے کرام ہندوستان کے مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے تھے، لیکن گجرات و دکن میں صوفیوں کی بڑی

تعداد موجود رہی۔ خلجی اور تغلق حکمرانوں نے گجرات و دکن میں حکومتیں قائم کیں اور وہاں اردو کی ترقی ہوئی۔ دکن و گجرات میں سیاسی حکمرانوں سے پہلے صوفیا اس زبان کا پودا لگا چکے تھے۔ زبان کے استعمال اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں صوفیا کا یہ کارنامہ نہایت اہم ہے کہ انھوں نے نومولود عوامی بولی کو سیکھا اور ذریعہ اظہار بنایا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کو پیدا ہوتے ہی صوفیا نے گود لے لیا۔ اس طرح اردو بازاروں میں پیدا ہوئی، خانقاہوں میں پلی اور جوبن آنے کے بعد ہی درباروں میں پہنچی۔ ایسے دور میں جب تصنیف و تالیف اور علمی اظہار کے لیے فارسی کا استعمال ہوتا تھا، صوفیا نے یہ کفر توڑا اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی نومولود اردو زبان کا استعمال کیا۔

ایک نومولود زبان کو استعمال کر کے اور ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچا کر صوفیا نے اردو زبان پر جو احسان کیا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ ابتدائی دور کے صوفیا کے چند اقوال یا الفاظ سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں۔ بعض صوفیا کے ملفوظات کو معتقدین نے تحریری شکل دے کر محفوظ کر دیا ہے۔ بعد کے دور کے بہت سے صوفیا صاحب تصانیف رہے ہیں جن کی کتابیں اور رسالے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔ صوفیا کے آثار جو اقوال و ملفوظات اور نظم و نثر کے رسالوں اور کتابوں کی شکل میں موجود ہیں، اردو زبان کی تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ساتھ ہی مختلف علاقوں میں قدیم اردو کے مختلف روپ اور چلن کا اندازہ بھی ہوا ہے۔

صوفیا کی زبان اکھڑی اکھڑی، ناہموار اور قدامت کے غبار میں ڈھکی ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری آج کی زبان کن مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ ان کے استعمال کیے ہوئے بیش تر الفاظ آج متروک ہو گئے ہیں جو قدیم اردو کے ذخیرہ الفاظ کا پتا دیتے ہیں۔ صوفیا کے آثار کی شکل میں قدیم اردو کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی مدد سے ماہرین کو اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے میں آسانی ہوئی ہے۔ نہ صرف اردو زبان بلکہ دوسری جدید آریائی زبانوں کی ابتدائی شکل و صورت کا ایک ہلکا سا خاکہ بھی ہمیں صوفیا کے لسانی نمونوں میں نظر آتا ہے۔ اس طرح صوفیا کے کارنامے لسانی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں کہ قدیم اردو کے نمونوں کی دستیابی کا یہ واحد سرچشمہ ہیں۔

4.11 مشکل الفاظ کے معنی:

لفظ	معنی
آب زر	سونے کا پانی یا روشنائی
اپنیچ	اپنا ہی ہے
استدلال	دلیل دینا، ٹھوس بات کہنا
استعارہ	شاعری کی ایک خوبی، شعر میں حسن پیدا کرنے کا ایک طریقہ

اصفیا	صوفی اور پاک باز لوگ
لفظ	**معنی**
اعتراف	ماننا۔اقرار کرنا۔تسلیم کرنا
اقوال	قول کی جمع۔کہی ہوئی باتیں
اکابر	بڑے لوگ
آثار	نشانیاں
آراستہ	سجا ہوا
بالا	بچہ۔چھوٹا
باطنیت	روحانیت۔صوفیوں کا خاص وصف
برجستگی	موقع کی مناسبت سے کہی گئی بے کھٹک بات
برگزیدہ	منتخب لوگ۔بلند مرتبہ ہستیاں
بِسرانا	بھلانا
پردۂ خفا میں ہونا	چھپا ہوا ہونا
ترویج واشاعت	پھیلاؤ
تصدیق	سچائی کا پتا لگانا۔سچ ہونے کا ثبوت حاصل کرنا
تغیرات	تبدیلیاں
تفریق	فرق۔تمیز
تلمیح	شاعری میں کسی تاریخی واقعہ کے حوالے سے بات کہنا
تمثیل	مثال دینا۔کسی خیال کو ٹھوس شکل میں پیش کرنا
جدوجہد	کوشش
جوبن	جوانی
داغ بیل	بنیاد۔شروعات
دستیاب ہونا	ملنا۔پایا جانا
دیومالا	دیوی دیوتاؤں کے قصے
ربط وتسلسل	کسی واقعے کا ایسا بیان جس میں ہر بات ایک دوسرے سے متعلق اور مسلسل ہو۔

لفظ	معنی
رسالہ	مختصر سی کتاب
رشد و ہدایت	صحیح راستہ دکھانا
روابط	رابطہ کی جمع۔تعلقات
روحانیت	باطنیت۔قلب و ل کی پاکیزگی
روشناس کرانا	پہچان کرانا
زریں	سنہری
سماع	سننا۔گانا یا قوالی سننا
سلوک	تصوف کے طریقوں پر چلنے کی راہ
شریعت	مذہب کے اصول
شناسا	جانا پہچانا
صَرف نظر کرنا	نظر پھیرنا
صنائع و بدائع	شاعری کے زیور۔شاعری میں حسن بیان پیدا کرنے کے مختلف طریقے
عار	شرم
عدم دستیابی	نہ ملنا
عظمت	بڑائی
علامت	نشان۔پہچان
فیوض	فیض۔برکت
قدامت	پرانا پن
قلب	دل
ماہر نفسیات	انسان کے باطن کو سمجھنے والا
محیط ہونا	احاطہ کیے ہونا۔گھیرے میں لیے ہوئے
محسن	احسان کرنے والا
مرجع خلائق	جہاں لوگ اپنی امیدیں لے کر جائیں

لفظ	معنی

مستحق	حق دار
مستند	جس کے صحیح ہونے کی سند ہو
متصوفانہ	صوفیانہ
معتقدمین	اعتقاد اور یقین رکھنے والے مرید
معذرت	معافی چاہنا۔مجبوری
معرفت	پہچان
مقیم	قیام کرنا۔رہنا
ملفوظات	اقوال۔کہی ہوئی باتیں
منسوب	نسبت ہونا۔کسی سے رشتہ ہونا
موسیقی	سنگیت
مسیت	لفظ مسجد کا بگاڑ۔مسجد
نشرواشاعت	پھیلانا
نصف اوّل	پہلا آدھا حصہ
نغمہ سرا	گانا۔شاعری کرنا
نومولود	نئی پیدا ہوئی چیز
وجود	ہستی۔ہونا
ہجری	ہجرت نبیؐ سے منسوب سال عربی کے سال اور مہینے

4.12 نمونہ امتحانی سوالات:

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پچاس الفاظ میں دیں۔

(۱) شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

(۲) خوب محمد چشتی پر ایک نوٹ لکھیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تین سو الفاظ میں دیں۔

(۱) کبیر داس کے احوال وآثار اور نمونہ کلام لکھیے۔

(۲) صوفیا کے اقوال اور کلام کی تاریخی اور لسانی اہمیت بیان کیجیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب آٹھ سو الفاظ میں دیں۔

(۱) حضرت امیر خسرو کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

(۲) دکن سے تعلق رکھنے والے دو صوفیا کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

4.13 مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابیں:

(۱) اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاے کرام کا کام ..... مولوی عبدالحق

(۲) تاریخ ادب اردو، جلد اوّل ..... جمیل جالبی

(۳) نقد ملفوظات ..... نثار احمد فاروقی

بلاک ۳۔اہم شعری دبستان

اکائی ۷:اردو کی ترقی میں دبستان دہلی کا حصہ

اکائی ۸:اردو کی ترقی میں دبستان لکھنؤ کا حصہ

اکائی ۹:تحریک آزادی میں اردو ادب کا حصہ (قومی اور حب الوطنی شاعری کے حوالے سے)

اکائی۲ اردو شاعری کی ترقی میں دبستان دہلی کا حصہ

اکائی۳ اردو شاعری کی ترقی میں دبستان لکھنؤ کا حصہ

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 اردو شاعری کی ابتدا وارتقاء

2.4 دبستان دہلی

2.4.1 دبستان دہلی کا قیام

2.4.2 دبستان دہلی کی شناخت

2.4.3 دبستان دہلی کی شاعری

2.5 دبستان لکھنو

2.5.1 دبستان لکھنو کا قیام

2.5.2 دبستان لکھنو کی شناخت

2.5.3 دبستان لکھنو کے نمائندہ شعرا

2.6 خلاصہ

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.8 سفارش کردہ کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کا مقصد اردو ادب خصوصاً شاعری کے دو اہم دبستان یعنی دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی خدمات اور اس کی شناخت کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سمجھ پائیں گے کہ:

- ☆ دہلویت اور لکھنویت میں کیا فرق ہے؟
- ☆ دبستان دہلی کی خصوصیات کیا ہیں؟
- ☆ دبستان لکھنو کی پہچان کیا ہے؟
- ☆ دبستان دہلی میں کن شاعروں کو شامل کیا جا سکتا ہے؟
- ☆ دبستان لکھنو سے کن شاعروں کو وابستہ کیا جاتا ہے؟
- ☆ دبستان دہلی میں کس طرح کی شاعری دیکھنے کو ملتی ہے؟
- ☆ دبستان لکھنو سے وابستہ شاعروں نے کس طرح کی شاعری کی ہے؟
- ☆ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی زبان میں کیا فرق ہے؟

2.2 تمہید:

اردو شعر و ادب کے ابتدائی نمونے دکن میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن انھیں وقار شمالی ہند نے عطا کیا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دکن میں ادب کے قابل قدر نمونے نہیں ملتے۔ آج بھی اردو نثر کا اولین ہی نہیں بلکہ بہترین نمونہ دکن کا ہی ہے تو شعری ادب میں بھی ادب کے شاہکار میں دکن کی کئی تخلیقات شامل ہیں۔ شمالی ہند میں غزلیہ شاعری کو دکن کے ولؔی کی آمد کے بعد ہی وقار حاصل ہوا۔ یعنی 1700 کے بعد شمال میں غزلیہ شاعری کے نہ صرف دکن بلکہ ملک کے کسی بھی خطے سے زیادہ بہتر اور معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شاعری کے ابتدائی زمانے سے ہی شمالی ہند کے شاعروں نے غزل کے موضوع اور زبان کی اصلاح کے حوالے سے خاطر خواہ کام کیے۔ انہیں کارناموں کی وجہ سے شمالی ہند کے دو اہم مراکز کی اپنی

منفرد شناخت قائم ہوئی۔ انھیں شناخت کو ادب میں دبستان کے نام سے جانتے ہیں، یعنی دبستان دہلی اور دبستان لکھنو۔ ان دبستانوں نے نہ صرف لسانی اور ادبی سطح پر شاعری میں تفریق پیدا کی بلکہ ذہنی اور علمی سطح پر بھی تبدیلیاں لائیں۔ دہلی میں دل اور محسوسات کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں تو لکھنو میں تفریح اور خارجیت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دلی میں داخلیت کی شاعری ہو رہی تھی تو لکھنو میں خارجیت کا غلبے تھا۔ انھیں نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان دونوں دبستانوں کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

طالب علموں کی سہولت کی خاطر اس اکائی میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں تا کہ وہ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد اسے سمجھنے اور ذہن نشیں کرنے کی غرض سے ان سوالوں کو حل کر سکیں۔

2.3 اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء:

اردو شاعری کے ابتدائی نمونے ہمیں دکن میں ملتے ہیں۔ تفصیل کے لیے نصیر الدین ہاشمی کی کتاب دکن میں اردو دیکھی جا سکتی ہے۔ دکن میں معیاری شاعری کے نمونے سولہویں صدی میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ جن میں فیروز اور محمود اہم نام دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اہم شاعر کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ سترہویں صدی کے شعرا کا دیوان بھی اب شائع ہو چکا ہے۔ شمال میں اردو شاعری کے بہترین نمونے اٹھارہویں صدی سے ملنا شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے شاعری ہوتی ہی نہیں تھی۔ ولی کے دلی آنے سے پہلے بھی بہت سے شاعر کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سراج الدین علی خاں، ٹیک چند بہار اور جعفر زٹلی نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری پر تفنن کا عکس نظر آتا ہے یعنی اپنی تسکین کے لیے شعر موضوع کیا کرتے تھے۔ چوں کہ اس زمانے میں فارسی کا غلبہ تھا اور یہ شعرا فارسی کے رنگ میں ہی شعر کہا کرتے تھے جو فارسی کے رنگ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ہاں ان کے آخری زمانے کی شاعری قدرے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ ولی کے دلی آنے کے بعد پہلے دور میں حاتم، آبرو، مضمون، شاکر ناجی اور یک رنگ وغیرہ نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام شعرا نے غزل کی زلفیں

سنوارنے کے ساتھ ساتھ زبان کی اصلاح کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی۔یہی وہ زمانہ ہے جب ایہام گوئی عروج پر تھی اور اسی زمانے میں اسے ترک بھی کیا گیا۔حاتم نے اپنے دیوان سے ایہام کے اشعار خارج کرنے کے بعد دیوان زادہ شائع کیا۔ان شعرا کے کلام میں تصنع نہیں ہے۔جو محسوس کرتے ہیں سیدھے سیدھے بیان کر دیتے ہیں۔نازک اور بعید تشبیہوں سے پرہیز دکھتا ہے تو سادگی اور بے تکلفی لطف دیتی ہے۔آبرو اور حاتم اس دور کے نمائندہ شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ٹھیک اس کے بعد میر و سودا کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔اور پھر غزل اپنے پورے شباب پر دکھائی دیتی ہے۔اس دور کی غزل میں آپ بیتی دکھائی دیتی ہے۔چوں کے اب زبان کی اصلاح ہو چکی ہے اس لیے اکثر گلکاری بھی نظر آتی ہے۔

اس کے بعد کا دور انشا، مصحفی، رنگین و جرأت کا ہے۔شاعری کے موضوع پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دور رجائیت کا محسوس ہوتا ہے۔مصحفی پرانی روش کو اپنائے ہوئے ہیں تو انشاء، جرأت اور رنگین شاعری میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ان شاعروں کے طریقہ عشق اور معیار حسن میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔غزل میں چوما چاٹی اور معاملہ بندی کے مضامین دکھائی دیتے ہیں۔یہی وہ دور ہے جب پہلی بار معرکہ آرائی دکھائی دیتی ہے۔اس کے بعد آتش اور ناسخ کا زمانہ آتا ہے۔اب مبالغہ غلو کی شکل اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔بلکہ غلو کے ساتھ ساتھ نازک خیالی اور تصنع کا اس قدر غلبہ دکھائی دیتا ہے جس طرح ظہوری اور بیدل کے یہاں بھی نہیں ملتا۔اسی دور میں ایک جانب شاہ نصیر، ذوق اور ظفر دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف مومن اور غالب نظر آتے ہیں۔اس کے بعد داغ، میر مہدی مجروح، شیفتہ اور حالی وغیرہ کا دور آتا ہے اور پھر اس کے بعد جدید دور جس کا سرا موجودہ شاعری سے آ کر ملتا ہے۔

2.4 دبستان دہلی:

دہلویت دراصل ایک نقطۂ نظر، ایک افتاد ذہنی اور ایک مزاج شعری کا نام ہے۔اکثر دہلویت یا دبستان دہلی یا دبستان لکھنؤ کا ذکر کرتے ہیں تو ایک دوسرے کا تقابل ہو جاتا ہے۔اور یہ فطری بھی ہے کیوں کہ ایک دوسرے میں تفریق کی وجہ سے ہی دونوں دبستانوں کی شناخت قائم کی گئی اور اب تک یہ محسوس کیا

جاتا ہے۔ جب ہم دبستان دہلی سے تعلق رکھنے والے شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے باوجود کہ ان میں سے بہت سے شعرا لکھنو منتقل ہو گئے یا لکھنو کا سفر کیا یہ فرق صاف دکھائی دیتا ہے۔ اور اسی فرق کو دبستان سے تعبیر کرتے ہیں۔

جب ہم زبان وادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ جب سے زبان اردو پروان چڑھی دہلی ہر قسم کی سیاسی آفتوں کا نشانہ بنی رہی۔ جعفر زٹلی سے لے کر غالبؔ اور داغؔ تک تقریباً تمام اہم شعرا نے زمانے کی ستم ظریفی کا سامنا کیا اور نتیجے میں شہر آشوب بھی لکھا۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ دہلی کے بادشاہ تک شاعری کے ذریعے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے نظر آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری اس کی عمدہ مثال ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک معاشی بدحالی کا شکار ہو، کسی طرح کا امن وسکون نصیب نہ ہو اور روز روز نئے نئے انقلابات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو تو یاں کے باشندے کیوں نہ مایوس اور دل گرفتہ ہو کر خوف خدا اور ناپائداری دنیا میں اپنی پناہ تلاش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ دبستان دہلی سے وابستہ شعرا کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ان میں درد وغم اور یاس وحسرت کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔

2.4.1 دبستان دہلی کی ابتدا:

ہم جانتے ہیں کہ دہلوی شاعری میں درد وغم اور یاس وحسرت کا رنگ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں تصوف کی عمدہ مثال ملتی ہے کیوں کہ ایسی صورت میں انسان کو اس کا پروردگار یاد آتا ہے۔ شاعری کے ابتدائی دور میں شاعروں نے محبوب کی تلاش میں اپنے پروردگار تک پہنچے یا پروردگار کو ہی محبوب مانا۔ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور کو بھی دیکھیں تو ہمیں یہی رنگ ملے گا۔ مثال کے طور پر امیر خسرو کے کلام کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دہلی کی ابتدائی شاعری پر فارسی کا بہت گہرا اثر دکھائی دیتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایرانی تہذیب میں تصوف کا رنگ کتنا غالب ہے۔ اس کی تقلید میں دہلوی شاعر پہلے معشوق حقیقی سے مخاطب ہوا اس کے بعد رفتہ رفتہ معشوق مجازی یا مصنوعی پر فریفتہ دکھائی دینے لگا۔

2.4.2 دبستان دہلی کی شناخت:

دہلی میں شاعری تو ہو رہی تھی لیکن اس پر فارسی کا بہت گہرا اثر تھا۔ ولؔی اور اس کی شاعری کا دلی آنا مبارک ثابت ہوا اور اس کے بعد فارسی کے اثر سے شاعری آزاد ہوتی نظر آئی۔ اس آزادی کے ساتھ ہی شاعری میں ایہام گوئی کا غلبہ دکھائی دینے لگا۔ یعنی ولی کی تقلید میں جن شاعروں نے شعر کہے انھوں نے اپنے اشعار کی بنیاد ایہام گوئی پر رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کے ابتدائی دور کے شعرا آبرؔو، حاتؔم، مضمونؔ، شاکرؔ، احسن اللہؔ، ناجیؔ، یک رنگؔ وغیر کے یہاں اس قبیل کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔

دبستان دلی کے شعرا نے سب سے پہلے زبان کی صحت وصفائی کی جانب توجہ کی۔ انھوں نے ایسے الفاظ اور محاورات جو ثقیل اور مشکل تھے ان کو متروک قرار دیا۔ دلی کے قدیم شعرا نے جذبات کے خلوص اور صداقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے اشعار کی خوبی کا دارو مدار لفظی گورکھ دھندوں کے بجائے جذبات کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور قلبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں روحانی مضامین اور وجدانی کیفیت کی کثرت ہے۔ مضمون کے ساتھ ساتھ بیان میں بھی دبستان دلی کی شاعری نے بڑا کمال پیدا کیا۔ عشق وعاشقی، ہجر ووصال، شکوہ وشکایت، حرف وحکایات کے جو مضمون شاعر برتتے چلے آرہے تھے انھیں اپنی زبان میں اس خوبی سے ادا کیا کہ ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔ ان کی بندشیں پہلے کے مقابلے زیادہ چست اور لطیف اور محاورے زیادہ دل آویز ہیں۔ تشبیہ اور استعارہ کے استعمال میں بھی فنکاری اپنے عروج پر ہے۔ اپنی جدت طبع سے انھوں نے جذبات اور خیالات اور مضامین میں باریکیاں نکالیں۔ ان کے اشعار میں نزاکت اور لطافت کا پہلو کو زیادہ واضح اور روشن نظر آتا ہے لیکن تخیل کی پرواز میں انھوں نے کبھی حقیقت اور فطرت کو فراموش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی ان شعرا کے کلام کی تازگی اور اہمیت قائم ہے۔

2.4.3 دبستان دہلی کی شاعری:

جیسا کہ کہا گیا کہ دلی میں شاعری کا آغاز ولی کے دلی آنے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ولی کے دلی آنے کے بعد نہ صرف شاعری کا رنگ بدلا بلکہ اردو میں شعر کہنے کا رواج بھی زور

پکڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد نہ صرف دبستان دلی بلکہ اردو شاعری کا ارتقاء تیزی سے ہونا شروع ہوا۔ دبستان دلی کا سفر اتنا طویل ہے اور اس دبستان سے متعلق شاعروں کی تعداد اتنی ہے کہ ان پر الگ الگ گفتگو یہاں نہیں کی جاسکتی اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے مختلف دور میں تقسیم کر کے اس دور کی شاعری کی خصوصیات بیان کر دی جائے۔

دبستان دہلی کو کم از کم چھ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں دلی میں شاعری کی ابتدا سے لے کر ولؔی کا دلی آنا اور ان کی شاعری کے زیر اثر کی گئی شاعری کو رکھا جا سکتا ہے۔ اس دور کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول فارسی کے ان شعرا کو دیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے یوں تو فارسی میں شعر کہے لیکن تفنن طبع کے لیے ریختہ میں بھی اپنا کلام چھوڑا۔ محمد شاہ کے آخری زمانے تک ایسے شاعر ملتے ہیں۔ ان میں خان آرزو، شمس الدین فقیرؔ، مرزا علی قلی خاں ندیمؔ، عبدالغنی قبولؔ، ٹیک چند بہارؔ، آنند رام مخلصؔ، مرتضٰی قلی خاں فراقؔ کے ساتھ ساتھ محمد شاہ کے اوائل زمانے کے شاعر سعداللہ خاں گلشنؔ اور بیدلؔ وغیرہ اہم ہیں۔ دوسری قسم ان شاعروں کی ہے جنھوں نے ریختہ میں شعر کہے۔ ان میں جعفر زٹلی اور اٹلؔ اہمیت کے حامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جعفر زٹلی اور اٹل کے درمیان معرکے بھی رہتے تھے۔ اگر اس دور کی تہذیب و تمدن، ثقافت اور سیاسی صورت حال کا احساس کرنا ہو تو ان شعرا کے کلام سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

دوسرے دور میں ان شاعروں کو رکھا جا سکتا ہے جنھوں نے ولؔی، ان کے کلام اور دیوان کے دلی آنے کے بعد ان کی تقلید یا ان کے اثرات قبول کر کے شاعری کی۔ ان میں وہ شاعر بھی شامل ہیں جنھوں نے ایہام گوئی میں اپنا کمال دکھایا اور ترک ایہام گوئی کے ساتھ ساتھ اصلاح زبان کی تحریک بھی شروع کی۔ اس دور کے نمائندہ شاعروں میں شاہ مبارک آبروؔ، شاہ حاتمؔ، شرف الدین مضمونؔ، محمد شاکر ناجیؔ، محمد حسن احسنؔ، ناجیؔ، غلام مصطفٰے خاں یک رنگؔ، میر مکھن پاک بازؔ، محمد اشرف اشرفؔ، ولی اللہ اشتیاقؔ، دلاور خاں بیرنگؔ، شرف الدین علی خاں پیامؔ، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہی دور ہے جب اردو شاعری کا چرچا تیز ہو گیا۔ ساتھ ساتھ ہی ساتھ ان ایہام گو شعرا میں سے کئی نے زبان کی اصلاح کی جانب بھی اپنی توجہ کی۔ اس زمانے کی شاعری کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حاتمؔ نے اپنے پہلے

کے کلام میں سے بہت سا کلام ترک کر کے 'دیوان زادہ' کے نام سے اپنا نیا دیوان ترتیب دیا تھا۔

اس دور میں تین طرح کی زبانوں کا پتہ چلتا ہے جن میں شعرا طبع آزمائی کر رہے تھے۔ اول خالص دکنی زبان جس میں دکن میں شاعری کی جا رہی تھی۔ دوسرے فارسی جس میں خصوصاً شمالی اور عموماً ہندوستان کے دوسرے حصے میں شعرا اپنا کلام نہ صرف محفوظ کر رہے تھے بلکہ فخر محسوس کرتے تھے۔ تیسری وہ زبان ہے جس میں ولی شاعری کر رہے تھے اور جب وہ دلی آئے تو مزید سیقل ہوئی اور اسی زبان کو نہ صرف دلی بلکہ پورے ہندوستان میں شاعری کے لیے قابل تقلید مانا گیا۔ جس زبان کی تقلید کی گئی وہ بھی اس شکل میں نہیں تھی جو ہمیں بعد میں نظر آتی ہیں۔ پہلے فارسی آمیز اردو تھی تو بعد میں فارسی اور دکنی کا مرکب محسوس ہوئی۔ اسے مربوط اور باضابطہ شکل دینے میں ایہام گو شعرا نے اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں رعایت لفظی عام اور مقبول ترین صفت تھی۔ اس لیے کم و بیش تما ایہام گو شعرا کے یہاں نہ صرف یہ صفت موجود ہے بلکہ پسندیدہ صفت ہے۔ لیکن ترک ایہام گوئی کے ساتھ ہی اس صفت کو بھی معیوب نہیں تو اچھا نہیں سمجھا گیا۔ اب زبان میں فصاحت اور سلاست کا زور نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کے دور کی شاعری نسبتاً آسان نظر آتی ہے۔

دبستان دلی کا تیسرا دور میرؔ و سوداؔ، فغاںؔ اور دردؔ کا دور ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں نہ صرف زبان بلکہ مضامین اور اصناف میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ اسی دور میں شاعری نے عروج پایا اور اسی دور میں شاعری میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کو وہ مقام حاصل ہوا جس کی مثال بعد میں کم کم ہی ملتی ہے۔ اسی دور میں ان شعرا کی کاوشوں اور دماغ سوزیوں کی بدولت زبان نے وسعت اختیار کی۔ الفاظ، افعال، محاورات، تراکیب، تشبیہات، استعارات، صنائع لفظی اور معنوی سطح پر ایسی اصلاحیں اور تبدیلیاں کیں جو کانوں کو بھلا لگے اور مانوس ہو کر رواج پا سکیں اور انھوں نے خود اس پر عمل کر کے اسے نہ صرف مستحسن بلکہ مقبول عام بھی بنایا۔ غزل کی تکمیل میں میرؔ، سوداؔ، قائمؔ اور سوزؔ پیش پیش رہے تو قصیدے میں سوداؔ۔ مثنوی میں میرؔ، اثرؔ، میر حسنؔ اور مصحفیؔ نے کارہائے نمایاں انجام دیا تو مرثیہ کی جانب سکندرؔ، مسکینؔ، گدا، افسردہ وغیرہ نے کامیاب کوشش کی۔ اس دور کے شعرا پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ سب کے سب اپنے فن میں یکتا

ہیں۔میرؔ نے عشق اور درد محبت کا ایسا بلند نقطۂ نظر پیش کیا جو آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا۔سوداؔ نے شوکت و جزالت کے ایسے ہنگامہ آفریں مرقعے پیش کیے جن کا آج تک جواب نہ ہوا۔درد نے صوفیانہ خیالات کو جس پاکیزگی، روانی اور شگفتگی کے ساتھ پیش کیا وہ بھی آپ ہی اپنی نظیر ہے۔منظر کشی، انداز بیاں اور سیرت نگاری کے خوش نما نمونے اپنی مثنویوں میں میر حسن نے پیش کیے۔غرض کہ اس دور کے ہر شاعر نے اپنی جگہ مقرر کر لی اور جو اہمیت قائم کی وہ آج تک مسلم ہے۔

یہی وہ دور ہے جب تذکرہ نویسی کی داغ بیل ڈالی گئی۔اب تک کی تحقیق کے مطابق جو تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ان میں اولیت اسی دور کے تذکرہ نویس کو حاصل ہے۔میرؔ اور ان کی پیروی کرتے ہوئے گردیزی، قائمؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ اور قدرت اللہ قاسمؔ اہم تذکرہ نویسوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

چوتھے دور کو تیسرے دور کی توسیع کہہ سکتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں تیسرے دور کے شعرا ضعیف ہو چکے ہیں تو ان کے نوجوان شاگردوں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو چکی ہے۔اس دور میں دونوں نسل اپنے فن پارے کی تخلیق میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔اس دور کے شعرا کی فہرست تیار کی جائے تو ان میں میر اثرؔ، حکیم ثناء اللہ فراقؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ، شاہ ہدایت، میاں شکیباؔ، میاں عظیمؔ بیگ، میر قمر الدین منتؔ، شیخ ولی اللہ محبؔ وغیرہ کے نام اس میں ضرور شامل ہوں گے۔

اس کے بعد کا دور نہ صرف دبستان دلی بلکہ اردو کا ایک اہم ترین دور ہے۔میرؔ و سوداؔ کے بعد یہی وہ دور ہے جس میں اردو شاعری کی کہکشاں نظر آتی ہے۔اس دور میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور ظفرؔ جیسے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔یہی وہ دور ہے جس میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کو بھی جگہ ملی۔ہنگامے، تفریح، مشاعرے اور معرکے کی وجہ سے شکوہِ الفاظ، بندش کی چستی، محاورے، روزمرے اور قادر الکلامی پر زور دیا جانے لگا۔اور اس زعم میں سنگلاخ زمینوں کا رواج ہو گیا۔اس دور میں شاعری کے دو اسلوب یا رنگ کا رواج دکھتا ہے۔اول قدیمی یعنی معنی کی جانب توجہ کرنے کا اور دوسرا شعر میں ظاہری خوبیاں پیدا کرنے کا۔اول رنگ غالبؔ، مومنؔ اور ان کے رفقاء میں دکھتا ہے تو دوسرا رنگ ذوقؔ، ظفرؔ اور ان کے رفقاء میں نظر آتا ہے۔

زبان کی سطح پر بات کی جائے تو اس دور کے شعرا نے مزید اصلاح کی۔ پہلے سے آرہے نامانوس الفاظ کو ترک کر کے فارسی تراکیبوں کی موجودگی کے ساتھ ساتھ دہلی کے روزمرے اور محاوروں کو اس طرح پرویا کہ اس میں مزید خوش نمائی اور شیرینی پیدا ہوگئی۔ غالبؔ و مومنؔ کی شاعری میں محاورہ بندی، روز مرہ، مضمون آفرینی اور زبان کا چٹخارہ زیادہ ہے تو شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں میں نئی تشبیہہ اور نئے استعاروں سے مضمون آفرینی کا باغ سجاتے ہیں۔ ذوقؔ کے یہاں بھی بعض اوقات زبان کا چٹخارہ، محاورے اور روزمرہ کی صفائی دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کی ایک بڑی خصوصیت استعاروں اور تشبیہوں کی جدت اور فراوانی بھی ہے۔ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس دور کے آتے آتے دبستان دلی پر لکھنو کے اثرات بھی مرتب ہونے لگے تھے۔ وجہ صاف ہے کہ اب سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ مغل حکومت سمٹ کر لال قلعے میں مقید ہو چکی تھی۔ ادھر دوسری جانب لکھنو کے حکمراں ادیب و شاعر کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اور لی کے شعرا لکھنو منتقل ہو رہے تھے۔ اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد تو گویا دلی اجڑ سی گئی تھی۔

دبستان دلی کا چٹھا دور داغؔ کے زمانے کو کہا جاتا ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب 1857 کی جنگ ہو چکی تھی اور دلی تقریباً بے حال ہو چکی تھی۔ خود داغؔ دلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے تھے۔ غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کے شاگرد مثلاً ظہیرؔ، سالکؔ، مجروحؔ اور آزادؔ وغیرہ بھی تلاش نعاش میں دلی سے باہر جا چکے تھے۔ تقریباً دلی خالی ہو چکی تھی اور دہلویت کا رنگ بھی کم و بیش پھیکا پڑ چکا تھا اگر کچھ باقی تھا تو زبان کی حد تک۔ داغؔ کے یہاں دلی کے محاوروں اور روزمرہ پر زیادہ زور اور طبیعت میں شوخی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں چلبلا پن کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے شاگردوں کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں جوش و خروش کا فقدان اور مخصوص طرز کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ظہیرؔ شاگرد تو ذوقؔ کے تھے لیکن ان کے کلام میں مومنؔ کا رنگ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ سالکؔ اور مجروحؔ کی زبان تو سادہ ہیا وران میں محاوروں کی چاشنی بھی ہے لیکن غالب کی جدت اور تازگی کا فقدان ہے۔ گویا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس دور میں داغ کے علاوہ کوئی اور صاحب طرز شاعر نہیں نظر آتا۔ بقیہ تمام شاعر محض استاد کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے اندر کوئی نیا پن یا جوش و خروش نہیں ملتا۔ ہاں زبان پر زور ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ایک

وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دور کے ہلے کے شاعروں نے شاعری کو اس بام پر پہنچا دیا تھا جس سے اوپر کی منزل نظر نہیں آتی تھی ۔ اس مضبوط عمارت کی مختلف منزلوں میں مختلف رنگ و اسلوب اور فنکاری کے نمونے اور مضامین کو اس طرح پروئے گئے تھے کہ اس میں اضافے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی ۔

دبستان دلی کے آخری دور میں کوئی اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا گیا ہو یا نہیں لیکن محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے اپنے اپنے انداز میں دو اہم کارنامے انجام دئے ۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے ذریعہ اردو شاعری میں انقلاب کی نئی روح پھونکی تو الطاف حسین حالی نے شاعری میں اصلیت، جوش اور سادگی کی تلاش کا پیمانہ بنا کر شعر فہمی کی نئی راہ ہموار کی ۔ یہ اس لیے بھی ہو سکا کہ یہ دونوں دبستان دلی اور دہلی کے ادبی سرمائے سے بخوبی واقف تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصلاحات اب تک اردو شاعری کے لیے مشعل راہ ثابت ہو رہے ہیں ۔

2.5 دبستان لکھنو :

تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب کا بدل مانا جاتا ہے ۔ اور لکھنو کے شعر و ادب سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے ۔ دبستان لکھنو کے شعرا نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت یعنی بیان پر مرکوز کی ۔ دبستان لکھنو سے وابستہ شعرا کے زمرے میں ناسخ کو استاد سمجھا جاتا ہے ۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردوئے معلیٰ کو اردوئے مطلا بنا دیا ۔ فصاحت کے بجائے بلاغت، سلاست و سادگی کی جگہ تصنع اور آہ کے بجائے واہ کو شاعری کی جان سمجھ کر اسے نہ صرف برتا بلکہ اس کی تبلیغ کی ۔ انھوں نے جذبات نگاری کو ثانوی درجہ دے کر خارجی مضامین کے بیان کو فروغ دیا ۔ دبستان لکھنو کے قیام سے قبل شاعری میں حسن اور اس کی کیفیات، اس کے اثرات اور کارفرمائی عشقیہ شاعری کے لیے ضروری تھے ۔ لیکن دبستان لکھنو کی بنیاد ہی اس کی نفی سے رکھی گئی ۔ ہاں صرف ناسخ کے کلام میں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے ۔

2.5.1 دبستان لکھنو کی شروعات:

دبستان لکھنو کی ابتدائی نمونے تو ان شاعروں کے یہاں مل جاتے ہیں جنھوں نے ملک کے

مختلف حصوں سے لکھنو کا سفر کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ دلی جب بھی پر آشوب دور سے گزری تو یہاں کے شعرا نے لکھنو کا رخ کیا۔ خواہ وہ میر ہو یا سودا، وہ انشا ہو یا مصحفی۔ یہ تمام شعرا لکھنو آنے سے قبل نہ صرف اپنی شناخت قائم کر چکے تھے بلکہ اپنا لوہا بھی منوا لیا تھا۔ ان کا بہتر کلام لکھنو آنے سے قبل کا ہے۔ دبستان لکھنو کی بات کرتے ہیں تو اس کی باضابطہ اور دانستہ شروعات کا سہرا ناسخ کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس کی شروعات کی بلکہ اسے خاص رنگ بھی عطا کیا اور اس کی تبلیغ بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ دبستان لکھنو کے نمائندہ شعرا نے داخلیت کے بجائے خارجیت کو اہمیت دی اور شعر کی ظاہری صورت کو سنبھالنے کی فکر میں شعرا نے بڑے بڑے تجربے کئے انھیں تجربات میں ایک صنعت رعایت لفظی ہے۔ جن شاعروں نے اسے اپنی بدترین صورت تک میں برتا ان میں آغا حسن امانت اور دیا شنکر نسیم اہم ہیں، یہاں تک کہ شوق کی مثنویاں بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔

2.5.2 دبستان لکھنو کی شناخت:

دبستان لکھنو سے مراد شعر و ادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنو کے قدیم شعرا نے اختیار کیا۔ یہ وہ رنگ و آہنگ ہے جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر دلی کی قدیم شاعری سے مختلف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس لکھنو کے ابتدائی دور کے شعرا نے ردعمل کے طور پر پرانے رنگ میں تبدیلی کر کے ایک نیا انداز سخن پیدا کر لیا تھا۔ دبستان لکھنو کا اصل رنگ اس وقت نظر آتا ہے جب اس کا شباب تھا۔ یعنی وہ دور جب مال و دولت اور عیش و عشرت کی کمی نہیں تھی، ادیب و فنکار کی قدر کی جاتی تھی نتیجے کے طور پر ملک کے مختلف خطوں سے ادیب و شاعر لکھنو کی جانب کوچ کر رہے تھے۔

دبستان لکھنو پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ سب سے پہلا اثر جو یہاں کی شاعری پر پڑا وہ یہاں کی معاشرت تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب لکھنو میں ہر طرف عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ تعیش اور آزادی زندگی کا شیوہ بن گیا۔ تماش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ لکھنو کے نوابین کو عورتوں کی صحبت پسند ہونی لگی۔ لہٰذا بازاری عورتوں اور طوائفوں کی کثرت ہو گئی۔ اور حاکم کے ساتھ ساتھ ان کے امرا اور فوجی حکام بلا خوف

ایک ہی حمام میں نظر آنے لگے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ابتدائی شعروادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ ہے۔دبستان دلی کے برخلاف ایک نیا مزاج اور میلان نے لے لی جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا۔مثال کے طور پر جراءت کے کلام کو دیکھا جاسکتا ہے۔حالاں کے وہ دلی سے آئے تھے لیکن ان کے مذاق کی تسکین میں لکھنوی فضا کا بڑا دخل ہے۔

دبستان لکھنو میں نسائیت کا عنصر بھی شعروادب کا جزو بن گیا۔شاعری میں جذبات کی آگ کو دہکانے کے لیے اب عشق کا اظہار عورت کی جانب سے کرایا گیا اور قدرتی طور پر زبان اور خیالات عورتوں کے نظم ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ مردوں کے جذبات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی اور ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دے کر بے حیائی کی داستانی نظم کی جانے لگیں۔نسائیت کا اثر صرف ریختی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوا بلکہ عام خیالات، زبان اور محاوروں میں بھی نسائیت دکھائی دینے لگی۔

جب لکھنو کے نواب کو دلی سے آزادی ملی تو وہ اس آزادی کا اظہار اس طرح کیا کہ تہذیب و تمدن سے لے کر لباس اور وضع قطع تک میں نئی نئی تراشیں اور خراشیں نکالیں۔آداب مجلس، نشست و برخاست اور گفتگو میں بھی فرق پیدا ہوا۔اس کا اثر شعروادب پر بھی پڑا۔اور اب شعروشاعری کا وہ معیار باقی نہ رہا جو دکن اور دلی کے شعرا نے قائم کیے تھے۔دوسری جانب اصلاح زبان کا سلسلہ جاری رہا۔اب زبان پختگی کی جانب بڑھتی معلوم ہوئی۔تذکیر و تانیث کے اصول ناسخ نے باقاعدہ مرتب کیے اور اس پر سختی سے اس پر قائم بھی رہے۔زبان کی صفائی کے سلسلے میں دبستان لکھنو کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔

2.5.3 دبستان لکھنو کے نمائندہ شعرا:

دبستان لکھنو کے ابتدائی زمانے میں دلی کے خاص شعرا یعنی میر ضاحک، سودا، فغاں اور میر یہاں آئے تو وہ غیر متعارف نہ تھے۔وہاں ان کا پورا احترام کیا جاتا تھا، اسی قدردانی کی وجہ سے وہ لوگ لکھنو میں قیام پذیر رہے اور ایک نیا مرکز ہی نہیں بلکہ ایک نئے دبستان کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی جس کی تقلید کرنے والے شعرا دبستان لکھنو کی فہرست میں شامل کیے گئے۔

دبستان لکھنو کے شعرا کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو میر ضاحکؔ کا نام اس میں نظر آتا ہے۔ سودا سے ہجو بازی کی وجہ سے وہ مقبول ہوئے۔ دبستان لکھنو کے ایک اہم مثنوی نگار میر حسنؔ بھی اپنے والد میر ضاحکؔ کے ساتھ فیض آباد آئے اور پھر لکھنو کے دارالسلطنت ہونے کے بعد لکھنو منتقل ہو گئے۔ ان کی مشہور مثنویوں میں 'سحر البیان اور گلزار ارم' شامل ہے۔ ان مثنویوں میں فیض آباد اور لکھنوی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ رسم و رواج اور اس دور کی زندگی کی عکاسی ہے۔ مثنویوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے مرثیے، قصیدے اور غزلیں بھی چھوڑی ہیں۔ ان کی غزلوں میں سادگی، گھلاوٹ اور دردمندی کے وہی رنگ ملتے ہیں جو میرؔ کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان آسان اور بول چال کی زبان کے قریب ہے۔

دبستان لکھنو کے شعرا میں شیخ قلندر بخش جرأت کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جرأت دلی سے فیض آباد آئے۔ جس وقت انھوں نے لکھنو ہجرت کی اس وقت سلیمان شکوہ کا دربار گرم تھا۔ لکھنو میں آصف الدولہ نے شاعر و ادیب کی سرپرستی کے لیے اپنا دل کھول رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جرأت دونوں آنکھوں سے اندھے تھے اور شاعری کے علاوہ موسیقی اور نجوم کا علم بھی رکھتے تھے۔ سلیمان شکوہ کے دربار میں پہلا مقام حاصل کرنے کے لیے چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ جرأت کو زبان کے استعمال میں کمال حاصل تھا۔ دھیرے دھیرے ان کا انداز لکھنو میں اپنی جگہ بنانے لگا اور بعد میں لکھنو کی خصوصیات میں شمار ہونے لگا۔ جرأت نے زیادہ تر غزلیں کہیں لیکن مرثیے، مثنویاں اور قطعات بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ جذبات انسانی کی پیش کش میں انھوں نے صرف عاشقانہ معاملہ بندی کو اپنایا اور اسے مختلف طریقوں سے پیش کرتے رہے۔

دبستان لکھنو کے نمائندہ اور ایک بڑے شاعر انشاؔ ہیں۔ انشاء بھی سلیمان شکوہ کے درباریوں میں تھے۔ بچپن فیض آباد میں گزرا تھا۔ انشاء کے والد ماشاء اللہ خاں بڑے عالم تھے اس لیے جہاں گئے ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ انشاء اللہ کو بھی اعلیٰ تعلیم ملی تھی اور اپنے والد کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے دربار کے آداب سے خوب واقف تھے۔ ذہانت، ذکی الحسنی اور تیزی و بیبا کی فطرت اور شخصیت کا جز بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں گئے اعزاز و اکرام سے نوازے گئے۔ جب وہ دلی سے لکھنو آئے تو یہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ جلد ہی اپنے کلام، چٹکلوں اور باتوں کی وجہ سے دربار کی جان بن گئے۔ نواب

سعادت علی خاں کو اپنی باتوں سے ایسا گرویدہ کرلیا کہ ان کی ناک کا بال بن گئے۔انھیں وہ وقار حاصل ہوا جو مشکل ہی سے اس دور کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل ہوا ہوگا۔غزلوں کے علاوہ مثنویاں، قصیدے، قطعات اور منظومات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دربار داری اور مسخرگی نے ان کی شاعری کی کئی سطحیں بنادی ہیں۔سنجیدگی اور فکر ہے تو سطح بلند ہے، ہنسوڑ پن اور چھیڑ چھاڑ ہے تو نیچی۔مختلف زبانوں کا بھی علم تھا۔فارسی دیوان کے علاوہ دریائے لطافت، رانی کیتکی کی کہانی اور سلک گہر ان کی مقبول کتابیں ہیں۔

اسی دور کے مقبول شاعروں میں سعادت یار خاں رنگینؔ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔تخلص کی مناسبت سے رنگین طبیعت کے مالک اور ہنسنے ہنسانے والے شخص تھے۔خیالات میں کوئی خاص وزن نہیں تھا۔اردو اور فارسی میں کئی تصانیف ہیں۔چار دیوان اور کئی مثنویوں کے ساتھ ساتھ شاعروں، مشاعروں اور ادبی مجلسوں کے تذکرے پر مبنی ایک کتاب مجالس رنگین کے نام سے موجود ہیں۔انھوں نے عورتوں کی بول چال کی زبان میں زندگی سے متعلق مسائل پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔رنگین نے اس صنف کو ریختی کا نام دیا۔کہا جاتا ہے کہ وہی اس صنف کے موجد ہیں۔ریختی میں جنسی مسائل کا ذکر کبھی کبھی عریانی تک پہنچ جاتا ہے۔

دبستان لکھنو کے ایک مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ بھی ہیں۔مصحفیؔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔تلاش معاش میں دلی چلے آئے اور جب یاں کامیابی نہیں ملی تو لکھنو منتقل ہوگئے۔یہاں انشاء کی دھوم تھی۔دربار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہور میں خوب چشمک اور رقابت رہی۔اس چشمک اور رقابت نے غیر مہذب صورت اختیار کرلی جس کا براہ راست اثر ان کی شاعری پر پڑا بلکہ اس کے لیے شاعری کا استعمال کیا۔اس لیا نشاء اور مصحفی کی عظمت کے باوجود ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت عزت و احترام کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔اس کے باوجود انھیں صرف دبستان لکھنو ہی نہیں بلکہ اردو کے اہم شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔

دبستان لکھنو کے سب سے نمائندہ شاعروں میں ناسخؔ اور آتشؔ کا نام لیا جاتا ہے۔لکھنو دبستان کی شناخت قائم کرنے میں ان شاعروں کا اہم کارنامہ ہے اس کی ایک اہم وجہ ان کی زبان دانی ہے۔یہ

دونوں ہی زبان کے نباز تھے۔امام بخش ناسخ نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنا نام پیدا کرلیا کہ لکھنو کے بڑے بڑے امرااور رؤسا ان کے شاگرد ہو گئے۔ناسخ نے دربار سے کبھی رشتہ نہیں جوڑا لیکن ان کے ارد گرد وہی ماحول رہا۔جب دربار نے انھیں پابند بنانا چاہااور انھوں نے انکار کیا تو انھیں لکھنو چھوڑ کر فیض آباد، بنارس اور کانپور میں قیام کیا۔وہ اپنے رنگ کے منفرد شاعر تھے۔ان کی شہرت دور دور تک پھیلی۔یہاں تک کہ نظام دکن کے دیوان مہاراجہ چندو لال شاداں نے ایک بڑی رقم بھیج کر انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔شعریت میں وہ دوسرے کئی شعرا سے کم تر ضرور ہیں لیکن معیاری زبان کے استعمال کے معاملے میں انھیں لکھنو کے دوسرے شاعروں پر سبقت حاصل ہے۔ان کی شاعری میں تصنع اور صنعتوں کا کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے اس لیے ان کی غزلیں اکثر روکھی ،پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہیں۔زبان کے متعلق انھوں نے جو کچھ کیا اس سے زبان کو ایک جانب فائدہ ہوا تو دوسری جانب نقصان بھی ہوا۔فائدہ اس طرح کہ زبان کے استعمال کے لیے ایک ایسا معیار بن گیا جس سے فن شاعری کے اصول مرتب ہوئے اور نقصان یہ ہوا کہ پابندی کی وجہ سے اس کی ترقی کے رخ محدود ہو گئے اور شاعروں ذہن جذبہ اور خیال کے بجائے الفاظ اور صنائع پر مرکوز ہو گیا۔

دبستان لکھنو کے شعرا میں ناسخ کی طرح ہی خواجہ حیدر علی آتش بھی اہمیت کے حامل ہیں۔بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک طرح کی آزادی اور بانکپن پیدا ہو گیا۔کچھ صوفی خانوادے سے تعلق رکھنے اور کچھ آزاد زندگی گزارنے کی وجہ سے قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی تھی جس کی جھلک ان کی شاعری میں بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کی شاعری میں ایسے عناصر تھے کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ لکھنو کے مشاعروں میں چمک اٹھے اور ان کا نام بڑے شاعروں میں لیا جانے لگا۔ناسخ کی طرح آتش بھی کبھی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ دربار سے انھیں اسی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا مگر وہ اسے غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔آتش کی شاعری بھی صنائع سے بھری ہوئی ہے۔ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف لفظوں اور صنعتوں کے لیے شعر کہتے تھے تو دوسری جانب بول چال کی زبان میں بڑی روانی جذبات و تاثرات کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔آتش

کا خیال تھا کہ شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں لفظوں کا اچھے سے اچھا استعمال ہونا چاہیے اس لیے ان کے یہاں فن کے ساتھ ساتھ جذبات اس طرح شامل ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔

دبستان لکھنو کو آتش و ناسخ کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ ناسخ کے تلامذہ میں وزیر، برق، گویا، رشک، سحر، منیر اور سرور تھے تو آتش کے تلامذہ میں رند، صبا، نسیم، خلیل اور شوق شامل تھے۔ ان شعرا نے دبستان لکھنو کی شناخت تو قائم رکھی لیکن اسے آگے نہیں بڑھایا۔ دبستان لکھنو میں اس وقت مزید اضافہ دکھائی دیتا ہے جب انیس و دبیر شاعری کے افق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر اردو مرثیے کے آفتاب و ماہتاب کہے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے مرثیے کی ایسی عظیم الشان عمارت تعمیر کر دی جس میں اب تک کوئی اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ چوں کہ انیس اور دبیر کا موضوع ایک تھا، زمانہ ایک تھا اور صنف سخن ایک تھا اس لیے لکھنو میں انیسیے اور دبیریے دو گروہ بن گئے۔ ان میں آپس میں خوب چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ مرثیہ خوانی کی محفلیں سجا کرتیں اور دونوں گروہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ جس نہ صرف مرثیہ کے فن کو عروج حاصل ہوا بلکہ شاعری بام عروج پر دکھائی دینے لگی۔

2.6 خلاصہ

دبستان دلی پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ یہاں عشق کا مسلک تمدن میں سرایت تھا اس لیے شاعری میں داخلیت کا غلبہ تھا۔ یہاں فقر و فاقے عام تھے لہٰذا شاعر کی حالت بھی بہتر نہ تھی اس لیے تصوف یہاں کے تمدن کا خاص طریقۂ نظر تھا۔ دہلی میں ولی کے زمانے سے لے کر ذوق و غالب کے زمانے تک یہ مضمون عاشقانہ مضامین کے بعد دوسرا درجہ رکھتا ہے۔ دبستان دلی کے شاید ہی کسی شاعر کا کلام ایسا ہو جس میں تصوف کا رنگ نہ پایا جاتا ہو بلکہ بعض نے تو صوفیانہ اور اخلاقی و مذہبی شاعری کو اپنا مسلک ہی بنا لیا تھا۔ گویا دہلی میں شاعری اپنی معنوی حیثیت سے ایسی بنیادوں پر کھڑی ہوئی جو انسان کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ اور قائم رہنے والی ہیں۔ سچی محبت کی روحانی وارداتیں انسانی زندگی کے ساتھ ہیں اس لیے دہلویت اردو شاعری میں ایک ایسی کیفیت ہے جو ہمیشہ لطف دینے، ہمیشہ قائم رہنے والی اور ہمیشہ نئے رنگ و روپ

میں نئے سرے سے پیدا ہونے والی ہے۔

دبستان لکھنو پر اگر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ لکھنوی معاشرے کا تعلق برہان الملک کے خاندانی حالت کی وجہ سے ایرانی تہذیب وتمدن سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف مرثیہ تو دوسری جانب ہرزیہ گوئی کی صورت تیزی سے نمودار ہوئی اور نتیجے میں تصوف کے اور عارفانے مضامین عنقا ہوگیا اوراس کی جگہ فرسودہ، خارجی عشق اور ہوسنا کی نے لے لی۔ مذہبی غلو اور توقل کے علاوہ نعت اور منقبت پر بڑا اثر پڑا۔ معاشی آسودگی نے عاشقانہ مثنویوں اور غزلوں کے مضامین پر خاص اثر ڈالا۔ لکھنو کی خاص تہذیبی حالت نے نسائیت پیدا کردی جس سے شاعری میں معاملہ بندی ، واسوخت اور ریختی کا خاصہ رواج ہوا۔ تکلف اور تصنع کی وجہ سے رعایت لفظی اور خارجی مضامین کو فروغ دیا اور اسی پر تکلف معاشرہ نے تشبیہات اور استعارات کا رواج بڑھایا۔ دبستان لکھنو سے وابستہ شعرا میں عربی اور فارسی کے عالم بھی تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اصلاح زبان کی تحریک بھی چلائی۔ ان کے درمیان معرکے بھی ہوئے اور ان معرکوں میں داخلی کے بجائے خارجی امور کو مدنظر رکھ کر اپنے علم کا مظاہرہ کیا گیا۔

دبستان لکھنو پر اختصار سے نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ یہاں شعر گوئی کا آغاز دلی سے آنے والے شعرا کے ذریعہ ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اپنی الگ شناخت بننے لگی۔ لکھنو کی تہذیب اور زندگی میں جو لچک اور نزاکت تھی اس نے خرجی حسن اور اس کے بیان کو تصنع کے رنگ میں رنگ دیا۔۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے مسائل اور موضوعات کی سنجیدگی پر شاعروں نے توجہ نہیں کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنو نے زبان کو خوبصورت اور لچکدار بنانے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا نتیجہ یہ نظر آیا کہ بہت سے شاعروں نے صرف الفاظ کے استعمال کو شاعری سمجھ لیا اور صنعتوں کے استعمال میں اپنی پوری توانائی لگادی۔ ہاں کچھ شاعر اور خاص کر مرثیہ گو ایسے ضرور ہوئے جنھوں نے سنجیدہ اور عظیم شاعری کی تخلیق کی۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات:

ا۔ دبستان دلی کی ابتدا وارتقا پر ایک مضمون لکھئے۔

۲۔ دبستان دلی کے نمائندہ شاعروں کا تعارف کروایئے۔

۳۔ دبستان دلی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ دبستان دلی پر ولی کے اثرات کی نشاندہی کیجیے۔

۵۔ دبستان لکھنو کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کیجیے۔

۶۔ دبستان لکھنو کے ابتدائی دنوں میں دہلوی شعرا کی نشاندہی کیجیے۔

۷۔ دبستان لکھنو کے نمائندہ شعرا کا تعارف کروایئے۔

۸۔ دبستان لکھنو کی خوبیاں اور خامیاں بیان کیجیے۔

2.8 سفارش کردہ کتابیں:

۱۔ تاریخ ادب اردو : پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

۲۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر تبسم کاشمیری

۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ : سید احتشام حسین

۵۔ دلی کا دبستان شاعری : ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

۶۔ لکھنو کا دبستان شاعری : ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اکائی ۹ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ (قومی اور حبّ الوطنی شاعری)

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 ہندستان کی تحریک آزادی

4.4 تحریک آزادی اور اردو ادب

4.5 تحریک آزادی اور اردو شاعری

4.5.1 تحریک آزادی سے منسلک اردو شاعر

4.5.2 تحریک آزادی سے متعلق اردو شاعری

4.6 خلاصہ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد تحریک آزادی میں اردو کا حصہ خصوصاً قومی اور حبّ الوطنی شاعری کے حوالے سے اردو شاعری کا جائزہ لینا اور ان شاعروں کی شناخت کرنا جنھوں نے جنگ آزادی میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سمجھ پائیں گے کہ:

- ☆ ہندستان کی تحریک آزادی کیا ہے؟
- ☆ تحریک آزادی اور اردو ادب کا کیا رشتہ ہے؟
- ☆ تحریک آزادی میں اردو شاعری نے کیا کارنامہ انجام دیا؟
- ☆ تحریک آزادی سے منسلک اردو کے کون کون شاعر تھے؟
- ☆ تحریک آزادی میں اردو شاعری نے کس طرح حصہ لیا؟

4.2 تمہید:

ہندوستان کی جنگ آزادی کی کڑی ہمیں سراج الدولہ کی شکست سے جوڑنا چاہیے۔ ہندوستان کے اس جنگ یعنی 1757 کے بعد انگریزوں کے قبضے میں جانے کا سلسلہ شروع ہوا اور ٹھیک اس کے سو سال کے بعد یعنی 1857 میں مکمل طور پر برطانوی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا۔اس سفر میں اردو شعر و ادب کے ذریعے اس جبر کی عکاسی اور اس کا بیان ہمیشہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کے والد اور اردو کے ایک اہم صحافی مولوی محمد باقر کو اپنی جان تک گنوانی پڑی۔اس کے باوجود اردو کے شاعر و ادیب نے اپنے مقصد کے حصول سے آنکھ نہیں موڑا اور مسلسل اپنے خیالات کا اظہار کبھی طنز و مزاح کے پردے میں تو اکثر بے باکی سے کرتے رہے۔ان ہی نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس اکائی میں ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو کا حصہ خصوصاً قومی اور حبّ الوطنی شاعری کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

طالب علموں کی سہولت کی خاطر اس اکائی میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں تاکہ وہ

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد اسے سمجھنے اور ذہن نشیں کرنے کی غرض سے ان سوالوں کو حل کر سکیں۔

4.3 ہندوستان کی تحریک آزادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا تجارتی جہاز 12 فروری 1601 کو انگلستان سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا اور 11 ستمبر 1603 کو واپس اپنے ملک پہنچا۔ اس کامیابی کے بعد پھر جہازوں اور تاجروں کا قافلہ مسلسل ہندوستان آتا جاتا رہا اور ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی قائم ہوگئی اور تجارت کے نام پر ہندوستان پر قبضہ کی کوششیں تیز تر ہونے لگیں۔ 1772 سے 1785 کے درمیان کا زمانہ کمپنی کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانے میں وارن ہسٹنگز کی نگرانی میں پلاسی کے میدان میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو 1757 میں شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کو بہت مضبوط کر لیا گیا اور پھر اس کے بعد 1799 میں لارڈ ولزلی نے میسور کے نواب ٹیپو سلطان کو شکست دے کر دکن میں بھی اپنے پیر جما لیے۔

بنگال ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں 23 جون 1757 وہ منحوس دن مانا جاتا ہے جب پلاسی کی جنگ کے دوران چند گھنٹوں میں ہندوستان کی قسمت پر غلامی کی مہر لگ گئی۔ یہ جنگ یوں تو بنگال کے حکمراں سراج الدولہ اور انگریز سوداگروں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوئی تھی لیکن اس کے اثرات نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر پڑے۔ فریب اور سازش ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرشت میں داخل تھا۔ لہٰذا اس نے ابتدا ہی سے اپنے اس فارمولے کو آزمایا اور اس کی وجہ سے اسے کامیابی بھی ملی۔ اس حوالے سے مصحفی نے لکھا ہے:

''کافر فرنگیوں نے ہندستان کی تمام دولت اور شان وشوکت دغابازی سے چھین لی۔''

ہمیں یاد ہے کہ سراج الدولہ کی شکست میں میر جعفر کا کیا رول تھا۔ کمپنی نے میر جعفر کو تخت نشیں کیا۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ میر جعفر کو بنگال کے عوام نے 'کلائیو کا گدھا' کے خطاب سے نوازا تھا۔ اور ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ جعفر کی تخت نشینی کے دوسرے ہی دن سوداگروں کی ٹولی اس گدھے پر چڑھ بیٹھی۔ گویا

ایسٹ انڈیا کمپنی کے وارے نیارے ہوگئے کیوں کہ صوبہ بنگال میں انگریزوں کو 'آزاد تجارت' کی چھوٹ مل گئی۔کلکتہ کے جنوب میں واقع چوبیس پرگنہ کا علاقہ 'مالِ مفت' کے طور پر ہاتھ لگا جس کا سالانہ لگان 2,22,951 روپیہ تھا۔اس طرح یکے بعد دیگرے مختلف علاقوں کی عملداری انگریزوں کے ہاتھ آتی گئی۔ 1760 تک میر جعفر انگریزوں کے لیے نہایت اطمینان بخش ثابت ہوا لیکن اپنے ہی داماد میر قاسم کی غداری کی وجہ سے میر جعفر کو نہ صرف تخت سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ جان کے لالے پڑ گئے۔اب انگریزوں نے میر قاسم کی سواری شروع کی اور اب بنگال کے ٹکسال کی چابی ان کے ہاتھ آ گئی۔اس کے بعد انگریزوں کی من مانی اس قدر بڑھ گئی کہ میر قاسم خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا۔ان حالات کی ایک ہلکی سی تصویر خود میر قاسم کے اس خط میں دکھتی ہے جو انھوں نے کمپنی کے افسر کو 1762 میں لکھا تھا:

''ہر پرگنہ، گاؤں اور منڈی میں انگریز گماشتے نمک، چاول، چھالی، گھی، مانس، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔رعایا کا مال زبردستی اٹھالے جاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے۔ان کے ظلم کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلے میں ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں ..... مجھے تقریباً پچیس لاکھ(25,00,000) روپے سالانہ نقصان ہو رہا ہے۔''

(بحوالہ طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ۔52)

اس کے باوجود بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ تو اس کا کوئی جواب دیا نہ ہی اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا بلکہ اس خط کے اندر جھلکتی میر قاسم کی بے بسی کو محسوس کرنے کے بعد مزید زیادتیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ایک دوسرے خط کا حصہ دیکھیں:

''کلکتہ فکٹری سے لے کر قاسم بازار، پٹنہ اور ڈھاکہ وغیرہ میں تمام انگریز حکام اور ان کے گماشتے، افسر اور ایجنٹ ہمارے علاقے کے ہر ضلع میں

کلکٹروں، کرایہ لینے والوں، زمینداروں اور تعلقہ داروں کی سی پوزیشن اختیار کیے ہوئے ہیں اور کمپنی کے جھنڈے لے کر میرے افسران کو کوئی اختیار استعمال نہیں کرنے دیتے۔ اس کے علاوہ ہر ضلع ، ہر گاؤں، ہر بازار، ہر پرگنے میں اپنی تجارت چلا رہے ہیں۔۔۔ ہر شخص جس کے ہاتھوں میں کمپنی کی دستک (تحریر) ہے اپنے آپ کو کمپنی سے کم نہیں سمجھتا۔''

(Romesh Dutt, Economic History of India, Vol. I, Page 13-15)

اس طرح نہ صرف کمپنی کا زور بلکہ ظلم بڑھتا گیا اور اس کے بدلے میں کمپنی کو بنگال کے نوابوں سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کا کیا کہنا۔ اب لاکھ کی محصولی بڑھ کر کروروں میں ہونے لگی۔ جب میر قاسم نے یہ قدم اٹھایا کہ ہندستانی تاجروں کا محصول معاف کر دیا جائے اور کمپنی نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستانی تاجروں کو شاید فائدہ ہو تو اس نے میر قاسم کی جگہ میر جعفر کو پھر سے نواب بنا دیا۔ جب ایک بار پھر میر جعفر سے کام نکل گیا تو اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس صورتِ حال میں بنگال نہ صرف مالی طور پر کنگال ہو گیا بلکہ اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی حیثیت سے بھی قلاش ہو گیا۔ دوسری جانب ایسٹ انڈیا کمپنی کا نہ صرف پورے ہندوستان میں جال بچھنے کا سلسلہ شروع ہوا بلکہ ہندوستان کی دولت بھی اس کے قبضے میں آنے لگی۔ اس طرح ہمیں یہ کہنے میں شاید عار محسوس نہ ہو کہ 1857 کے انقلاب کی کڑیاں جنگِ پلاسی سے جا کر ملتی ہے جو ہندوستان میں دورِ غلامی کی ابتدا ہے۔ پلاسی کے بعد 1764 میں بکسر کی جنگ میں شہنشاہِ ہند کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور 1765 میں اس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر کے انتقال اختیارات کو قانونی شکل دے دی۔ 1772 میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کی راست اختیارات سنبھالنے کے ساتھ برطانوی حکومت کے نظام کی بنیاد ڈالنی شروع کر دی اور یہیں سے برطانوی اقتدار کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

دوسری جانب حیدر علی کی قائم کردہ ریاست میسور جو 1761 میں محض 33 دیہاتوں پر مشتمل

ایک تحصیل سے شروع ہوکر صرف بیس برسوں میں 80 ہزار میل پر محیط ریاست بن گئی۔ حیدر علی کی موت کے بعد ٹیپو سلطان نے 1782 میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ان بیس برسوں میں ان باپ بیٹوں نے تین مرتبہ براہ راست اور نہ جانے کتنی بار بالواسطہ انگریزوں کے دانت کھٹے کئے۔ ہر بار انھیں سرخروئی حاصل ہوئی۔ ان کے حوصلے کو دیکھتے ہوئے بہت سے چھوٹے موٹے نوابوں نے بھی انگریزوں سے لوہا لینا شروع کر دیا۔ جب ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں باگ ڈور آئی تو انھوں نے مزید حوصلے کے ساتھ برطانوی طاقت سے مقابلے کا سلسلہ شروع کیا۔ انھیں اپنے پہلے دور یعنی 1782 سے 1792 تک فتوحات اور کامرانیاں نصیب ہوئیں لیکن ان کے دوسرے دور یعنی 1793 سے 1799 کے درمیان کئی بار ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس عرصے میں ان کی کم وبیش آدھی حکومت ان کے ہاتھ سے جاتی رہی اور خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ اس درمیان انھوں نے معاہدہ بنگلور کیا لیکن انگریز اپنی خصلت سے کہاں بعض آتے۔ حالاں کہ اس درمیان ٹیپو نے انگریزوں کو دور رکھنے کی کئی کامیاب کوششیں کیں۔ لارڈ ولزلی 1798 میں جب گورنر جنرل بن کر آیا تو یہ تہیہ کر کے آیا کہ وہ ہندوستان میں ملک گیری کی پالیسی پر عمل کرے گا۔ اس غرض سے وہ پٹ کا قانون اپنے ساتھ لایا۔ اس قانون کو دیکھتے ہی ٹیپو کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا کہ اس منصوبے کے ذریعے انگریز برعظیم میں موجود ہر طاقت کو بے دست و پا کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اسے فوراً ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد انگریز نہ صرف ٹیپو کے مخالف ہو گئے بلکہ ان کے دوست اور ان کو ملنے والی امداد کو بھی ان کے مخالف کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اندرونی اور بیرونی امداد کو ٹیپو کے مخالف کرنے اور سازشوں کے بعد ولزلی نے جنگ کا بہانا پیدا کیا۔ نتیجتاً جنگ کا اعلان ہوا اور ٹیپو کے خود اپنے لوگ بھی غدار ہو گئے اور ٹیپو اپنے ملک اور زمین کو برطانیہ کی حکومت سے بچاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لہٰذا انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور میسور پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

اس قبضے کا سلسلہ بڑھتا گیا اور پھر 1857 کے واقعے سے ہم سب واقف ہیں کہ مغل حکومت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کیا حیثیت رہ گئی تھی۔ میرٹھ سے جو دستہ دلی آیا اور ظفر سے رہنمائی کی گزارش کرنا اور اس کے نتیجے سے ہم سب واقف ہیں۔ اس وقت صرف دلی ہی نہیں پورے ملک میں

انگریزوں کے خلاف مہم چل رہی تھی۔ سپاہی اور عوام کے دلوں میں ہی غم وغصہ نہیں تھا بلکہ ادیب وشاعر کا قلم بھی اس کی مخالفت میں اپنی قوت دکھا رہا تھا۔ اس ذہنی اور فکری رویے کی عکاسی پورے ہندوستان میں تخلیق کیے گئے شعروادب سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر صادق الاخبار، دہلی 3 اگست 1857 کے شمارے میں شائع شدہ محمد غلام علی مشتاق کا یہ قطعہ دیکھیں:

عید ہر سال تمہیں تہنیت آمیز رہے
غرقِ خوں، جانِ عدو، خنجرِ خوں ریز رہے
قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر
نام کو بھی نہ جہاں میں سرِ انگریز رہے

دوسری جانب خود بہادر شاہ ظفر اس تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اور اپنے جنرل یعنی بخت خاں کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ صرف مراسلے اور پیغام بھیج رہے تھے بل کہ عوام کو سرگرم کرنے کی غرض سے جوش وولولہ سے پر منظوم کلام بھی پہنچا رہے تھے۔ ظفر کا ایک قطعہ دیکھیں:

لشکرِ اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھا گورے سے تا گوجر نصاریٰ قتل ہو
آج کا دن عید قرباں کا جبھی جانیں گے ہم
اے ظفر تہہ تیغ جب دشمن تمہارا قتل ہو

اس بغاوت کا نتیجہ کیا ہوا اس پر کسی تفصیل کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے بعد انگریزوں کی باضابطہ حکومت قائم ہوگئی۔

4.4 تحریک آزادی اور اردو ادب

ہم یہ جان چکے ہیں کہ ہماری آزادی کی لڑائی 1857 کے بعد نہیں شروع ہوتی ہے بلکہ 1757 سے ہی شروع ہوجاتی ہے اور اس لڑائی میں اردو زبان وادب اس زمانے سے ہی اپنا مثبت رول ادا کرتا رہا ہے۔ وہ دکن ہو یا شمال، وہ دلی ہو یا لکھنو، وہ عظیم آباد ہو یا رام پور غرض پورے ہندوستان میں ابتدائی زمانے سے ہی حب الوطنی سے متعلق شعروادب موجود ہے۔ تحریک شاہ ولی اللہ، تحریک مجاہدین، تحریک جنگ آزادی اور دوسری تمام کوششوں کا عکس

اردو شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بخوبی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے داستانوی ادب میں خیر و شر مسلسل متصادم نظر آتے ہیں تو ابتدائی ناولوں میں براہ راست انگریزوں کے خلاف مواد موجود ہے۔ اس دور کے ادب میں جو تہذیب و ثقافت کا بیان ملتا ہے اس میں ہمیشہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو برتر اور انگریزوں کی تہذیب کو بدتر دکھایا گیا ہے۔ اس کا جو نقشہ غالب کے خطوط میں ملتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ غالب نے 1857 کی جنگ آزادی سے قبل اور اس کے بعد کے واقعات جن الفاظ میں بیان کئے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے دلی کے لوگ، آپس کی دوستی، مشترکہ تہذیب، یہاں کے میلے ٹھیلے، شہر کی رونق اور فکر کے ساتھ ساتھ دلوں کی آزادی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ان کے فکر و خیال کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ چند جملے آپ بھی دیکھیں:

''جو دم ہے غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔''

(بنام حکیم غلام نجف، 9 جنوری 1858)

جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو غالب نے ان الفاظ میں ان کے ظلم کو بیان کیا۔

''مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں۔''

اسی خط میں آگے چل کر شہر کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857 تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ، 5 دسمبر 1857)

غالب نے دلی کی تباہی اور بربادی کے بارے میں جس تفصیل سے میر مہدی مجروح کے نام خطوط میں بیان کیے ہیں اتنی تفصیل کہیں اور نہیں ملتی۔ ایک خط کے چند جملے دیکھیں:

''دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔''

(بنام میر مہدی مجروح، 2 دسمبر 1859)

غالب کے علاوہ اور بھی بہت سی نثری تصنیفات ہیں جو جنگ آزادی سے متعلق ہیں یا ان میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سعادت یار خاں رنگین کی 'اغیار رنگین' ظہیر دہلوی کی 'داستان غدر' اور سرسید احمد خاں کی 'اسباب بغاوت ہند' اہمیت کی حامل ہیں۔

4.5 تحریک آزادی اور اردو شاعری

ہندوستان کی تحریک آزادی میں شاعر و ادیب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان شاعر و ادیب کی ذہن سازی میں کئی اہم شخصیات، اداروں اور تحریک ورجحان کا اہم کردار ہے۔ سرسید تحریک سے ہم سب واقف ہیں۔ اس کے محرک سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقہ یعنی شبلی، حالی، نذیر، ذکاء اللہ کے کردار سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اداروں کی بات کریں تو ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند نہایت سرگرم نظر آتے ہیں تو اس میں تحریک رد عیسائیت، تحریک اتحاد اسلامی، تحریک ریشمی رومال، تحریک ہوم رول، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات نے آگ میں تیل کا کام کیا اور ادیب و شاعر نے ان سے توانائی حاصل کر کے اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام میں تحریک و توانائی پیدا کی۔ اس پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور شاعری پر الگ الگ گفتگو کی جائے۔

4.5.1 تحریک آزادی سے منسلک اردو شاعر

جب ہم اردو شاعروں پر نظر ڈالتے ہیں تو انجمن پنجاب سے متعلق شعرا پر سب سے پہلے نظر

جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انجمن پنجاب نے نظم گوئی کے ضمن میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔اس جانب مولانا محمد حسین آزاداور مولانا الطاف حسین حالی نے جس توجہ سے کام کیا اس کا اثر آج تک کی شاعری میں بخوبی دکھائی دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جنگ آزادی سے متعلق شاعروں کی فہرست جب بناتے ہیں تو ان میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کا نام سرفہرست آتا ہے۔اس کے بعد کے شعرا کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔اس فہرست میں شاعری کی تمام اصناف سے متعلق شاعروں کو بخوبی جگہ ملے گی۔ابتدائی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

حالی اور شبلی سے تحریک پا کر مولوی نذیر احمد نے شاعری کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان کے مجموعۂ کلام 'نظم بے نظیر' میں ایسی کئی نظمیں مل جاتی ہیں جن میں وطن سے محبت اور آزادئ کا جذبہ موجود ہے۔ اگر ہم دوسرے دور کی فہرست مرتب کریں تو اس میں عبدالحلیم شرر، اسمٰعیل میرٹھی، برج نرائن چکبست، سرور جہاں آبادی، علامہ اقبال، نادر کاکوروی، حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کا نام اس میں ضرور شامل ہوگا۔ان شعرا کے بعد کے محبّ وطن اور آزادی کے متوالے شاعروں میں جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، سیماب اکبر آبادی، وحشت کلکتوی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، احمد سہیل اور کوکب شادانی اہمیت کے حامل ہیں۔

1936 میں ترقی پسند ادبی تحریک کی باضابطہ شروعات ہوئی۔ترقی پسند تحریک کا ایک اہم مقصد حصول آزادی تھا۔اس لیے اس تحریک سے منسلک تمام شاعر و ادیب کی تحریر میں وطن سے محبت اور ملک کی آزادی کے نغمے ضرور ملیں گے۔ان شعرا نے نہ صرف آزادی کے گیت لکھے بلکہ بہ آواز بلند اور بلاخوف اپنے مقاصد کا اظہار کیا۔ان میں سے اکثر کو قید و بند کی سعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ان میں جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی وغیرہ کے کارناموں کو فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔ترقی پسند شاعروں کے علاوہ حامد اللہ افسر اور الطاف مشہدی کا نام بھی جنگ آزادی کے متوالوں میں شامل کر سکتے ہیں۔

4.5.2 تحریک آزادی سے متعلق اردو شاعری

جب ہم جنگ آزادی سے متعلق شاعری کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں نظم جدید کی تحریک کا جائزہ لینے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اردو نظم میں کسی خاص موضوع کے تحت مسلسل نظم گوئی کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے سے متعلق کلام میں ہمیں وطن پرستی کا جذبہ شدت سے دکھائی دیتا ہے اور انقلاب کا دھواں بھی اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مولانا الطاف حسین حالؔی کی شاعری میں حب الوطنی کا تصور انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں میں پیدا ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو وطن اور اہل وطن کی محبت، دوستی اور ہمدردی و خیر خواہی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھیں ملک کی غلامی کا احساس اور اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ وہ انگریزوں کی پالیسیوں سے بھی واقف ہو چکے تھے تبھی تو کہتے ہیں:

پاس انہیں گر اپنا ذرا ہو جان اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

حالی کی مانند شبلی نے بھی وطن سے محبت اور اس کی آزادی کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ ان کی نظم 'صبح امید' سے ہم سب واقف ہیں۔ شبلی نے اپنے ملک کے نوجوانوں کو للکارتے ہوئے آزادی کے مشعل کو اٹھانے کی ترغیب ان الفاظ میں دی:

ہاں کمر بستہ ہو اے قوم ترقی کے لئے　　آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا

نوجوانو یہ زمانے کو دکھا دینا ہے　　اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالانِ چمن ہوتم لوگ　　دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا

مولانا محمد حسین آزاد کی شاعری کا خاص موضوع حب الوطنی، محبت ومروت، محنت وکاوش، امن وانصاف اوراخلاق ومعاشرت ہے۔ان تمام کا رشتہ آزادی سے ہے۔ان کی شاعری میں نئی نسل کو زندگی کی نئی ذمہ داریوں اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار رہنے کا سبق ملتا ہے۔آزاد کو احساس تھا کہ ہندوستان کے عوام غلامی کے اثرات سے مایوس اور مضمحل ہوتے جارہے ہیں اوران میں ترقی کرنے کا جذبہ کم ہوتا جارہا ہے۔لہٰذا عوام کے دلوں میں وطن سے محبت اوران میں عزم پیدا کرنے کی کوشش کی۔

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم　　کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدان عزم و جزم کے ہوشہسوار تم　　بڑھ جاؤ گے کروگے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو

اسمٰعیل میرٹھی کو اکثر بچوں کے شاعر کہہ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ عبوری دور میں ملک وقوم کی فکر کرنے اور نوجوانوں کو جگانے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کی جانے پر زور دیتے رہے۔انھوں نے غلام ملک کو آزاد کرانے کا خواب نوجوانوں کو دکھایا جس کی تعبیر خوشگوار ہوئی۔انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا:

یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل　　گھسٹتے ہیں کانٹوں پہ گلہائے خنداں
یہی بننے والے ہیں ارکان قومی　　جو ارکان برے تو ایوان ویراں
انہیں پر ہے موقوف اعزاز ملت　　بناؤ انہیں جلد زیب دبستاں
زمانہ میں ہیں پیش ملکی مسائل　　کہ نظم و سیاست کا ہے دور دوراں
اٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ　　نہ بننے دو ہر گز غلام غلاماں
اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو　　تو پیدا کرو چشمۂ آبِ حیواں

اور پھر قوم وملک کی آزادی کا جذبہ دل میں رکھنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بجا کہا تھا:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر　　تو وہ خوف وذلت کے حلوہ سے بہتر

سیاسی اور سماجی اعتبار سے ملک جن حالات سے دوچار تھا شاعری میں اس کے اثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا جذبہ، سیاسی محکومی کا احساس اور آزادی کے تصور کو نہایت فنکاری سے باندھا جا رہا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو شاعروں کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا اور محکومی کا احساس انھیں بے چین کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ سرورؔ جہاں آبادی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت بخوبی ہوتا ہے۔

رحم کر رحم کر صیاد قفس میں افسوس　　چیختا کب سے ہے اک مرغ چمن زار وطن
چمن میں گیت انہیں آزادیوں کے گانے دے　　وطن کے پھولوں پر صیاد چہچہانے دے

سرور جہاں آبادی نے بنکم چندر چٹوپادھیائے کی نظم 'بندے ماترم' کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے اپنے زمانے کے اہم سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کو اپنی شاعری کے ذریعہ محفوظ کر دیا ہے۔

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے　　نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو
چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی　　شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا
یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں　　قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

علامہ اقبال اور ان کی حب الوطنی سے کون واقف نہیں۔ ان کی نظم قومی ترانہ کے طور پر آج بھی کم وبیش ہر تقریب میں گائی جاتی ہے۔ بچے اس نظم کو شوق سے گنگناتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستا ں ہمارا

وہ نہ صرف وطن پرست تھے بلکہ اتحاد کے بڑے حامیوں میں سے ایک تھے۔ان کی نظم ''ترانۂ ہندی، نیا شوالہ اور تصویر درد'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا　　چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسی زمانے میں اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص طنز و مزاح کے انداز میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا ہے۔وہ اپنے معاشرے کے گرد و پیش اور ہندوستانی عوام کے بدلتے مزاج کو اپنے شعری قالب میں نہایت کامیابی سے ڈھالا ہے۔مشرقی تہذیب کی پاسداری اور مغربی تہذیب کی تنقید کے پردے میں انگریزوں اور ان کی حکومت کے خلاف خوب لکھا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم پر بھی انگریزوں کے بڑھتے تسلط کا اظہار بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں　　مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پر مرتے ہیں
مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب　　قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبؔر　　کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

ہندوستان کی جنگ آزادی میں سودیشی تحریک کا اہم رول ہے۔ ہمارے قومی اور ملی رہنما مختلف اخبارات اور رسائل کی مدد سے اپنے مقاصد کی تشہیر کر رہے تھے ایسے میں اردو کے شاعر و ادیب کہاں چپ رہنے والے تھے۔شاعروں میں حسرت نے نہ صرف شعر کے بلکہ اس میں عملی طور پر حصہ لیا اور اس تحریک کی رہبری کی۔انھوں نے باضابطہ سودیشی کپڑوں کی دکان کھولی اور ان کے اس کام میں وقار الملک اور شبلی نعمانی نے مدد بھی کی۔حالی اور اقبال نے تحریری طور پر اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔اکبرالہ آبادی کے کلام میں سودیشی کی حمایت صاف دکھائی دیتا ہے جس کا ثبوت اوپر پیش کئے گئے اشعار بھی ہیں۔

ہوم رول تحریک 1916 میں لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بسنت کی قائم کی ہوئی تھی۔ یہ تحریک جنگل کی آگ کی مانند ملک بھر میں پھیل گئی۔ پھر اردو کے شاعر کہاں پیچھے رہتے انھوں نے بھی اپنی شاعری

کے ذریعے اس تحریک کے احساسات اور مقاصد کو عام لوگوں تک پہنچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نادؔر کاکوروی، اکبؔر الہ آبادی، برج نرائن چکبستؔ اور حسرتؔ موہانی کے بہت سے اشعار اس کی گواہی دیتے ہیں۔

تحریک خلافت کے آغاز سے ہی اردو کے ادیب وشاعر نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اس کی رہنمائی کرنے والے لیڈران میں شامل رہے۔ حسرتؔ موہانی، محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے کارناموں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ اقبالؔ، ظفؔر علی خاں اور آرزؔو لکھنوی نے بھی اپنے اشعار کے ذریعے عوام تک اپنے خیالات پہنچائے ہیں۔ حسرتؔ نے مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ خلافت تحریک کے دوران قید ہونے کا حال یوں بیان کیا ہے:

کچھ مرے دل ہی سے موقوف نہیں لذت غم
خوش اسی حال میں جوہؔر بھی آزادؔ بھی ہے

اس دور کے حالات کا نقشہ ظفؔر علی خاں یوں کھینچتے ہیں:

خدایا تیرے گھر کی خاک اڑائی جارہی ہے کیوں
قیامت وقت سے پہلے ہی آئی جارہی ہے کیوں

پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ جو ہندوستانی ان کے ساتھ ہیں ان کو انعام سے نوازیں اور جو ان کے مخالف ہیں انھیں بغیر کسی عدالتی کارروائی کے قید کردیا جائے۔ اس کے خلاف گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی مہم کا آغاز کیا۔ اسی دوران جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ہی ترک موالات کی تحریک کا اعلان کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات اور اعزازی عہدے واپس کرنے کے ساتھ ساتھ تمام سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے انکار کردیا جائے۔ جن تعلیمی اداروں کو انگریز حکومت چلاتی ہے یا مدد دیتی ہے وہاں سے طلبہ کو نکال لیا جائے اور برطانوی عدالتوں، مجالس مقنّنہ اور ان کے انتخابات اور غیر ملکی اشیا کی مخالفت کی جائے۔ اس تحریک میں بلاتفریق مذہب وملت ہندوستان کے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ عوام بھی شامل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس

تحریک کو بہت زیادہ مقبولیت ملی۔ اردو کے شاعر و ادیب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس زمانے کی بہت سی نظمیں اور غزلیں اس کی ثبوت ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کا 'گاندھی نامہ' اس تحریک کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ان کے اشعار دیکھیں:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا — باطل کو حق سے دست و گریبان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر — آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز — کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کر دیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق — ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کر — شیرازہ سلطنت کا پریشان کر دیا

اور پھر یہ شعر انگریزوں کے اصل ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے:

پوچھتا ہوں 'آپ گاندھی کو پکڑتے کیوں نہیں؟' — کہتے ہیں 'آپس ہی میں تم لوگ لڑتے کیوں نہیں؟'

اکبر کی شاعری تحریک آزادی کے زمانے کے سیاسی ہیجانات کی مظہر ہے۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے مخصوص لہجے می برطانوی اقتدار اور اس کے اثرات کی مختلف صورتوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکات کے ضمن میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی شاعری میں قومیت، معاشرتی اصلاح اور وطن پرستی نمایاں ہیں۔ برطانوی حکومت سے ہوم رول حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ وہ حکومت کو اپنی وفاداری کا برابر یقین دلاتے اور کبھی کبھی حقیقت حال بیان کر دیتے تھے۔ حکومت برطانوی کے خلاف کبھی نرم تو کبھی سخت لہجہ اختیار کرتے ہیں۔

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے — نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو
وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک ستمگر نے — نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا
زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے

جنگ آزادی میں مولانا محمد علی جوہر کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کی صحافتی اور

سیاسی خدمات کا تو سبھی اعتراف کرتے ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات پر کم کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ وہ ایک اہم نثر نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے جنگ آزادی اور اس دوران ان کی قید و بند کی زندگی اور انگریزوں کے مظالم کا علم ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں چھنڈوارہ کی نظر بندی کے زمانے کی تخلیق کردہ ہے۔ خلافت تحریک کے دوران جلسے اور جلوسوں میں شرکت اور عوام سے خطاب اور صحافتی مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے شاعری پر مستقل توجہ نہیں دی۔ لیکن نظر بندی اور ایام اسیری میں ان کی شاعری تخلیق ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ملک کی جنگ آزادی کی تحریک اور ان میں پیش آنے والی مشکلات اور مظالم کی عکاسی کرتا ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

ہے بدترین عذاب یہی اک شریف پر — یارب کرائیو نہ اطاعت کمین کی
یوں تو ہے ہرسو عیاں آمد فصل خزاں — جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
سرفروشی کے لئے پیر و جواں ہیں تیار — آج رونق پہ ہے کس درجہ مکان دہلی

جنگ آزادی کے سپاہیوں میں ایک اہم نام مولانا ظفر علی خاں کا بھی ہے۔ ان کی شاعری میں جدو جہد آزادی کے مختلف مراحل کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ان کی شاعری میں جنگ آزادی سے متعلق تمام تحریکات اور اس کے ہنگامے اور ہیجان و اضطراب کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اس دور کی سیاسی صورت حال سے واقفیت ہوتی ہے تو ایک شاعر کی عملی رہنمائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے ان موضوعات پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں ''ڈیڑھ سو سال کی وفاداری کا صلہ، مظالم پنجاب، جنرل ڈائر'' وغیرہ مقبول ترین نظمیں ہیں۔ ظفر علی خاں کی شاعری حریت پسندی اور وطن پرستی کے جذبات سے مزین، عملی کردار اور دعوت فکر اور درس عمل سے کا عکاس ہے۔

جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ہے کہ انھوں نے جن تصورات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا وہ اس وقت کے ہندوستان کے لیے مشترک اور عام تھی۔ نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق کی مذمت اور معاشی جبر و استحصال ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ اشتراکیت

کے حامی تھے۔انھیں سامراجیت سے سخت نفرت تھی۔یہی وجہ ہے کہ برطانوی اقتدار اور تسلط سے نفرت کا اظہار جابجا اور کھل کر کیا ہے۔حکومت برطانیہ کے خلاف متعدد نظمیں تخلیق کیں جن میں ''وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام، دفاق، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، دام فریب، شکست زنداں کا خواب، نئے مہرے، ہنٹر کو سلام'' وغیرہ چند مشہور نظمیں ہیں۔انھوں نے بجا کہا تھا:

سنو اے ساکنان خاک پستی ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیات جاوداں سے

تحریک آزادی میں شدت کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی شدت کا احساس ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو نہ صرف جنگ آزادی کے دوران مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ آج بھی وہ اتنی ہی مقبول ہے کیوں کہ استعمار اور جبر واستبداد کا بازار اب بھی گرم ہے۔چند اشعار دیکھیں:

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہل مشن شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں
جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلال شاہی سے حضور حضرت دیول جھکائے جاتے ہیں
بجا رہے ہیں بلندی پہ ساز آزادی 'وٹو' کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں

بڑی کاریگری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں نئے دھوکے، نئے حیلے، نئے چکمے، نئے جھانسے
ہزاروں تجربوں کے بعد اب یہ عقل آئی ہے کسے تھپکے، کسے گھرکے، کسے چھوڑے، کسے پھانسے

جنگ آزادی کے سپاہیوں میں ایک اہم نام حسرت موہانی کا ہے۔انھوں نے اپنی شخصیت کو جدوجہد کا پابند کر کے اپنے ملک اور قوم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ہندوستان کی سیاسی اور معاشی صورت حال کا احساس انھیں بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاسی امور میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔وہ مکمل آزادی چاہتے تھے۔اس لیے ہمیشہ برطانوی حکومت کے مخالف رہے۔مختلف موقع پر تین گرفتار ہونے کے بعد بھی حکومت کے جبر وستم سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔اور اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ عملی سطح پر مکمل آزادی کے خواہاں اور انگریزوں کے سخت مخالفت کرتے رہے۔انھیں

یقین تھا کہ یہ سیاسی غلامی اور غیر ملکی اقتدار چند دنوں کا مہمان رہ گیا ہے۔لہٰذا وہ اہل وطن کو حصول آزادی کے لیے متحد اور منظّم رہنے کی ترغیب دیتے رہے، ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سیاسی رجحانات، وطن پرستی اور آزادی کے جذبہ کو بیدار کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں سیاسی جبر، محکومی اور غلامی کا شدید احساس دکھائی دیتا ہے۔ان کی شاعری اس زمانے کے عام مزاز کی عکاسی کرتا ہے:

غیر کی جدو جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ — کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتبار کر

بیکار ڈراتے ہیں مجھے قید ستم سے — واں روح وفا اور بھی آزاد رہے گی

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی — واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو — پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں — پھیلے گی یونہی شورش حب وطن تمام

ان کے علاوہ اس دور میں چند ایسے شاعر تھے جنھوں نے عملی سطح پر جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا لیکن ان کی شاعری میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ان شاعروں میں جگرؔ مرادآبادی، اخترؔ شیرانی، سیمابؔ اکبر آبادی، وحشتؔ کلکتوی، حفیظؔ جالندھری، تلوک چند محرومؔ، مولانا اقبال احمد سہیل، کوکبؔ شادانی وغیرہ نے سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ قومی اور ملی مسائل کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کئے ہیں۔

جنگ آزادی کی اس وقت اور بھی تیز نظر آتی ہے جب ترقی پسند ادبی تحریک 1936 میں شروع ہوتی ہے۔ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک خاص مقصد حصول آزادی قرار پاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس تحریک سے متعلق شاعر و ادیب نے جنگ آزادی میں عملی اور ادبی دونوں حیثیت سرگرم نظر آتے ہیں۔ان شعرا کی نظر میں غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدو جہد ترقی کا پہلا زینہ قرار پایا۔یہی وجہ ہے کہ اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے میں ترقی پسند شعرا میں زیادہ کھل کر اور بے باکی سے آزادی کا مطالبہ ملتا ہے۔اور یہ انداز حصول آزادی تک برقرار دکھائی دیتا ہے۔ان شعرا میں سے چند کے حوالے سے گفتگو ناگزیر ہے۔

ترقی پسند شعرا میں سردار جعفری ایک اہم نام ہے۔ان کی شاعری میں سیاست اور انقلاب کے

مختلف پہلو جا بجا نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی شاعری میں اس زمانے کے عام واقعات، تاریخ اور ہندوستان کی سیاست کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ چونکہ بغاوت ان کا نظریہ حیات تھا اس لیے وہ ہر اس عمل کی مخالفت کرتے ہیں جس سے حصول آزادی میں رخنہ پڑے۔ انھیں دنیا کے انقلابات کا علم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آنے والی تبدیلیوں کا بھی احساس تھا۔ اور انھیں پوری امید تھی کے اب انقلاب کا نتیجہ آنے ہی والا ہے۔ اس احساس ان کی غزلوں اور نظموں کے ذریعے شدت سے ہوتا ہے۔

بغاوت دورحاضر کی حکومت سے ریاست سے　　　بغاوت سامراجی نظم وقانون ریاست سے
بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے　　　بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے
جل اٹھے غلاموں کے سینے کے داغ　　　بکنگھم میں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصر شاہی ہلے تخت و تاج　　　نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج
نئی صبح ہے اور نیا آفتاب　　　مبارک زمانے کو یہ انقلاب

جنگ آزادی کے سرگرم سپاہی اور ترقی پسند شعرا میں مخدوم محی الدین کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں انقلاب کے ساتھ جذبات کا بہترین امتزاز ملتا ہے۔ انھوں نے سیاسی موضوعات کو رومانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر انقلابی اور سیاسی نظمیں شعری لطافت، آہنگ اور لطف بیان کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہیں۔ ان نظموں میں ملک کی غلامی، پستی اور بدحالی، انگریزوں کے مظالم اور جور و جبر کے مختلف پہلو کی عکاسی ہوتی ہے۔ انھیں بدلتی ہوئی دنیا اور آنے والے انقلاب کا شدت سے احساس تھا جس کا اظہار اپنی نظموں اور غزلوں میں جا بجا کیا ہے۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم　　　خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
زمین پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی　　　وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　　آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی　　　محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　　　دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے

ان کے علاوہ چند ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جن کی شاعری میں احتجاج اور سیاسی موضوعات شامل ہیں۔ ان میں فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، اسرارالحق مجاز، معین احسن جذبی وغیرہ نے وطن پرستی اور انقلاب کے گیت گائے۔ ان کی شاعری نے تحریک آزادی کے متوالوں کے دلوں میں حرارت پیدا کرنے میں مدد کی۔

اسی دور میں کئی ایسے شاعر نے انقلاب کی آواز میں اپنی آواز شامل کی جو ترقی پسند تو نہیں تھے لیکن اپنے ملک سے محبت کا جذبہ اس سے کہیں زیادہ رکھتے تھے۔ ملک کو آزاد دیکھنے کی خواہش برابر تھی۔ ان شعرا میں حامد اللہ افسر اور الطاف مشہدی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

غرض ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو خصوصاً اردو شاعری کا جو حصہ ہے اس سے انکار ناممکن ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ ''انقلاب زندہ باد، سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' وغیرہ جیسے نعرے خالص اردو کی دین ہیں۔

4.6 خلاصہ

آپ نے محسوس کیا کہ جنگ آزادی کی تحریک کی شروعات کب اور کیسے ہوئی۔ مکل کے استحکام اور اس کی حفاظت کے لیے آزادی کے متواوں نے کس طرح جان کی قربانیاں تک دینے میں عار محسوس نہیں کیا۔ 1757 سے لے کر 1857 تک کے حالات کیا تھے۔ انگریزوں نے پہلے تجارت کے نام پر اپنے قدم جمانا شروع کیا۔ اور ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے کمپنی قائم کی اور پھر حکومت۔ 1857 میں باضابطہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کس طرح سے عوام پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور اپنی پالیسی اور فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کی بیش قیمتی اشیاء پر قابض ہوتے چلے گئے۔ اس دوران ہندوستان کے جیالوں نے برطانوی حکومت کے خاتمے کے لیے جو تحریکات چلائیں اور بلاتفریق مذہب ملت سب ایک ساتھ مل کر جس قوت کے ساتھ وطن سے محبت اور انگریزوں اور اس کی پالیسیوں سے نفرت کا ادبی و عملی

اظہار کیا اس کا نمونہ کیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی شاعری ان موضوعات اور خیالات سے پر ہے۔ عوام کے دلوں میں جوش اور گرمی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حاکم وقت سے نفرت پیدا کرنے کا جو کام شاعری نے کیا اس کے نتیجے میں انگریز حاکم ہندوستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہوئے اور 1947 میں ہندوستان آزاد ہوا۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوششوں میں سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ادیب و شاعر کی خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا سلسلہ کب سے اور کیسے شروع ہوا؟

۲۔ نواب سراج الدولہ نے ملک کی خدمت اور انگریزوں کی مخالفت کے لیے کیا کیا؟

۳۔ نواب سراج الدولہ کی شکست کے کیا وجوہات تھے اور ان کے بعد حکومت کیسے چلی؟

۴۔ میسور کی حکومت اور ٹیپو سلطان کی خدمات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، لکھئے؟

۵۔ 1757 اور 1857 کے درمیان ہندوستان کے کیا حالات تھے؟

۶۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو نثر نے کیا خدمات انجام دیں؟

۷۔ جنگ آزادی سے کون کون سے شاعر منسلک تھے؟

۸۔ اردو شاعری نے جنگ آزادی میں کیا کارنامہ انجام دیا۔ اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۹۔ جنگ آزادی سے متعلق شاعری سے متعارف کروایئے۔

4.8 سفارش کردہ کتابیں:

۱۔ تاریخ ادب اردو : پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

۲۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۔ تاریخ ادب اردو : ڈاکٹر تبسم کاشمیری

۴۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ : سید احتشام حسین

۵۔ ترقی پسند ادب : سردار جعفری

۶۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک : قمر رئیس

۷۔ اسباب بغاوت ہند : سر سید احمد خاں

۸۔ نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری : ابواللیث صدیقی

اکائی ۱۰ علی گڑھ تحریک

1. تمہید

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہندوستان میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کی رفتار اچانک تیز ہوگئی مغلوں کے زوال کے بعد جس نئی سیاسی قوت نے غلبہ حاصل کیا اس پر نہ تو مسلمانوں کا اختیار تھا نہ ہندوؤں کا، بلکہ یہ قوت انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور یہ لگاتار بڑھتی ہی جارہی تھی۔ یوں تو شروع شروع میں انگریزوں کے مقاصد تجارتی تھے لیکن دھیرے دھیرے انھوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب بھی دیکھنا شروع کردیا۔ حیدرآباد، میسور اور اودھ پر قبضہ جمالینے کے بعد انگریز ملک کے بہت سے علاقوں کو عملی طور پر اپنا محکوم بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

انگریزوں کی اس بڑھتی ہوئی قوت اور مختلف علاقوں کی فتحیابی نے ہندوستان میں مغربی فکر ونظر کو پھیلنے اور غلبہ پانے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے اثر سے انیسویں صدی کے ہندوستان میں تین اہم فکری قوتیں ابھریں۔ اور ان سب نے ہندوستان کے منظر کو الگ الگ جہتوں اور مخصوص قومی مقاصد کے تحت متاثر کرنے کوششیں کیں، مثلاً:

1. سید احمد شہید نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے انگریزوں کے خلاف مسلمان قوم میں جذبہ جہاد کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔
2. دیانند سرسوتی نے قدیم آریائی سماج کے احیا کی کوشش کی۔ 1875 میں انھوں نے آریہ سماج قائم کیا اور عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لیے سنسکرت زبان کو ترک کرکے ہندی میں پرچار شروع کیا۔
3. راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خاں نے ماضی اور حال کے بجائے مستقبل کی فکر کی، اور قوم کو نئے نظریات، نئی فکر اور نئے علوم قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے لیے راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی اور سرسید نے علی گڑھ تحریک شروع کی۔ علی گڑھ تحریک اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس نے مسلمانوں کی بے عملی ختم کی، اس کے جمود کو توڑا اور انھیں غلامی کے حصار سے نکال کر ایک بہتر مستقبل دینے کے اسباب پیدا کیے۔ اس لحاظ سے علی گڑھ تحریک کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

۲. علی گڑھ تحریک کا پس منظر:

سرسید نے جب 1869ء میں لندن کا سفر کیا تو اس سفر کے دوران وہ ایک ایسے خوشگوار تجربے سے گزرے جس نے ان کی سوچ وفکر کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ مغرب کے مشاہدے اور وہاں کی تہذیب وثقافت کے مطالعے نے انھیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ یورپ والوں کی ترقی ان کے عیسائی مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ ذہنی قوت کے استعمال اور نئے نئے علوم وفنون کے حاصل کرنے میں پوشیدہ ہے۔ سرسید کو خاص طور سے مغرب کے طریقۂ تعلیم نے بے حد متاثر کیا تھا۔

سرسید اس سے بھی حد درجہ متاثر تھے کہ وہاں کے معاشرے کو اپنی تہذیبی اصلاح پر مائل کرنے میں وہاں کے دو اخباروں ''ٹیٹلر'' اور ''اسپیکٹیٹر'' نے اہم رول ادا کیا تھا۔ انھوں نے لندن کے قیام کے دوران ہی پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر وہ بھی اسی طرز پر ایک رسالہ جاری کریں گے اور ایک ایسا ادارہ قائم کریں گے جس میں کیمبرج کی طرح تعلیم کا انتظام ہوسکے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو اوہام پرستی سے نکالنے اور جدید تعلیم کا قائل کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں بہت سے مضامین لکھے، اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی کے قیام کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کردیا۔ لندن میں ہی انھوں نے ''ہندوستان میں موجودہ تعلیمی نظام پر اعتراضات'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اسے وہیں سے شائع بھی کروائی۔ یہ کتاب

دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

ہندوستان آ کر انھوں نے رسالہ ''تہذب الاخلاق'' جاری کیا اور علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی جسے سرسید کے خواب کی عملی صورت کہنا چاہیے۔ بعد میں اسی مدرسۃ العلوم نے علی گڑھ تحریک کے لیے گہوارے کا کام کیا۔

علی گڑھ تحریک:

یہ حقیقت ہے کہ علی گڑھ تحریک کا بیج 1857 کی جنگ سے پھوٹا تھا۔ اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو شاید سرسید احمد خاں کی زندگی کی مشغولیات کچھ اور ہوتیں۔ یا پھر وہ اپنی مصنف اور مولف والی شہرت میں ہی آسودگی محسوس کرتے۔ سرسید احمد خاں اپنی زندگی میں کئی تحریکوں کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ اور دہلی کالج کی تحریک تو ان کی مزاج سازی میں بھی اہم رول ادا کر چکی تھی۔ دلی کالج آزادیٔ رائے، اجتہاد، بصیرت اور ٹالریشن کا اہم ادارہ سمجھا جاتا تھا، سرسید گو کہ اس کالج کے طالبعلم نہ تھے لیکن کالج کے اساتذہ ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر کارگل سے انھوں نے مسائل کے سائنسی تجزیے اور تصنیف و تالیف کے نئے اور منطقی انداز سیکھے تھے۔

اختلافات کو قبول کرنے اور اپنی رائے کو بصیرت سے منوانے کا جو جوہر سرسید کی شخصیت میں پہلے سے موجود تھا وہ دراصل دلی کالج کی صحبتوں میں ہی مزید پروان چڑھا تھا۔ انھوں نے راجہ رام موہن رائے کی طرح نئے علوم کو قبول کرنے کے لیے اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھی تھیں۔ علی گڑھ تحریک بھی انھوں نے راجہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کے طرز پر ہی چلائی۔ اس تحریک کی کامیابی کے لیے انھوں نے جگہ جگہ اسکول، کالج اور انجمنیں قائم کیں، اخبارات جاری کیے اور اپنی قوت حکومت سے اختلاف کرنے میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیری مقصدوں کی تکمیل میں صرف کیا۔

وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو علی گڑھ تحریک کے تین بنیادی مقاصد تھے:

1. پہلا مقصد: سیاسی۔ اس میں مسلمانوں کی تہذیبی بقا، سیاسی ترقی اور معاشرتی سربلندی شامل تھی۔
2. دوسرا مقصد: مذہبی۔ اس میں نئے علوم کی روشنی میں مذہب کی تشریح و توضیح اور اوہام پرستی کا خاتمہ کرنا شامل تھا۔
3. تیسرا مقصد: ادبی۔ اس میں اردو زبان و ادب کا فروغ شامل تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انفرادی شخصیت کی مانند قومی شخصیت بھی مذہب، سیاست اور ادب کے بغیر متوازن اور مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک جہت بھی نامکمل رہ جائے تو انسان کی شخصیت ادھوری اور غیر معتبر رہ جاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو 1857 سے پہلے مسلمان قوم کی شخصیت اس اعتبار سے مکمل تھی کہ وہ مذہب سیاست اور ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے بتدریج مسلمانوں کے درمیان دین اور دنیا کی خلیج حائل کرنی شروع کی اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

انیسویں صدی کی سیاسی کشمکش میں اس بات کو خاصی اہمیت حاصل ہے کہ مذہبی مدارس اور جدید مدارس کی تعلیم یک رخی تھی۔ یعنی مذہبی مدرسوں میں دینی تعلیم کے حصول پر زور دیا جاتا تھا اور نئے علوم کو حاصل کرنا گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح جدید مدارس میں نئے علوم تو حاصل کیے جاتے تھے لیکن مذہب کے روحانی عنصر کو دقیانوسیت سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے مسلمانوں کی شخصیت میں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے لوگوں میں منفی سوچ اور ایک دوسرے کے لیے شک اور حقارت کا مادہ پیدا ہونے لگا۔ یہ منفی سوچ، شک اور حقارت کا مادہ صرف جدید اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کے مابین ہی محدود نہیں رہا بلکہ یہ بیماری مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں عام ہوتی گئی۔ سرسید نے شخصیت کے اس خلا کو پُر کرنے اور شکوک شبہات اور حقارت کی اس مہلک بیماری کو ختم کرنے کے لیے انسانی زندگی کی ان تینوں جہتوں کو اہمیت دی۔ اور یوں ایک مکمل شخصیت کو وجود میں لانے اور ایک بہتر اور معیاری معاشرے کے قیام کے لیے انھوں نے علی گڑھ تحریک سے بنیادی نوعیت کا کام لیا۔

پہلا مقصد: سیاسی اور معاشرتی:

واضح رہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد مغرب نے اپنے علم و ہنر سے پوری دنیا کو تسخیر کرنے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں فوجیوں اور مذہبی مبلغوں کی آمد پندرھویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اسی طرح کا حملہ روس پر سترھویں صدی میں اور پھر آخری حملہ دوسری جنگ عظیم کے دوران کیا گیا، براعظم آسٹریلیا اور امریکہ کی دریافت بھی اسی مہم کا نتیجہ تھا۔ اسطرح کے حملوں کو روکنے کے لیے نئے ہتھیاروں کا استعمال ضروری تھا اس لیے جن جن ممالک میں مغربی اثرات ورسوخ نے پیش قدمی کی وہاں وقت اور حالات کے مطابق ایسے محبّ طن اور محبّ قوم رہنما بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ملک وقوم کی بقا، تحفظ اور مدافعت کے لیے مغربی طریقۂ تسخیر کو اپنایا۔ مثلاً مصر میں محمد علی پاشا، ترکی میں کمال اتاترک اور ہندوستان میں ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں سرسید احمد خاں۔ یہ اپنے ملکوں اور اپنے زمانے کے ایسے مصلحین تھے جنھوں نے مغربی علوم وفنون اور فکر ونظر کو سنجیدگی سے قبول کیا اور اپنے یہاں کی تہذیبی اور قومی شخصیت کو احساس کمتری، انتشار اور مایوسی سے بچانے کے لیے مغرب کے دریافت شدہ وسائل استعمال کیے۔ یہی وجہ ہے سرسید نے انگریزوں کی حکومت تو تسلیم کر لی لیکن ان کو ہندوستانی قوم کے طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔

علی گڑھ تحریک کی سیاسی جہت مسلمانوں کو پسماندگی سے نکالنے کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے لوگوں کی ذہن سازی کی گئی، مدرسۃ العلوم نے ایک نئی بصیرت سے آشنا کیا اور یورپ میں مدفون نایاب علمی خزانوں کو تراجم کے ذریعے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچا دیا گیا۔ علی گڑھ کے اس اساسی پہلو نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کیا اور انھیں احساس کمتری سے نکال کر تفاخر کے احساس سے آشنا کیا۔

سرسید کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ حکومت برطانیہ کے زیر تسلط مسلم معاشرے کی بہتری کی تدبیریں کی جائیں۔ سرسید ٹیپو سلطان اور سید احمد بریلوی کی ناکامی دیکھ چکے تھے اور کسی حد تک اس کے اسباب کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ چنانچہ سرسید نے اس حوالے سے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا جو خاکہ ترتیب دیا وہ اس طرح تھا:

1 مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو مذہبی اور سیاسی اختلافات ہیں انھیں دور کر کے مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے تاکہ دونوں قوموں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا ہو سکیں۔

2 مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول کی جانب راغب کیا جائے تاکہ وہ انتظامی امور میں انگریزوں کے شریک کار بن سکیں۔

3 انگریزی کے ساتھ اردو کو ایک معاون زبان کا درجہ دیا جائے اور اس کے لیے جدید علوم اور سائنس کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔

4 مسلم معاشرے سے ان خامیوں کو دور کیا جائے جو غیر فطری اور غیر مذہبی ہونے کے باوجود دل ودماغ میں صدیوں سے گھر کیے بیٹھی ہیں۔ قوم کو تہذیب کے صحیح مفہوم سے آگاہ کیا جائے تاکہ مہذب سماج میں مساویانہ حقوق کے مستحق ہو سکیں اور قابل قدر بن سکیں۔

5 اسلامی تعلیمات کی ازسرنو تشریح کر کے ان کو جدید علوم سائنس اور فلسفے سے ہم آہنگ کیا جائے۔ جس سے تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کے بنیادی عقائد پر قائم رہتے ہوئے نئے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور عقلی دلائل اور اعتدال پسندی کا رویہ اپنائیں۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس: کہنے کو تو مسلمان ایک قوم ہے لیکن سرسید جانتے تھے یہ قوم کئی فرقوں، طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہے۔ ان میں آپس میں نہ تو محبت ویگانگت ہے، نہ ہمدردی نہ بھائی چارہ۔ ان کی قومی اور تعلیمی حالت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ترقی کے اسباب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے ہر حصے میں بسنے والے مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی دونوں کا حال بھی تمام مسلمانوں کو معلوم ہو۔ چنانچہ سرسید نے 1886 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس کا مقصد دراصل مسلمانوں میں تعلیمی اور سیاسی بیداری لا کر انھیں باعزت مقام دلانا اور اپنی اہمیت کا احساس کرانا

تھا۔ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ہر سال اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا جن میں تمام سیاسی ،قومی اور تعلیمی امور زیر بحث آتے تھے۔

آیئے اس کے مقاصد اور دستور العمل کی تفصیل میں جانے کے بجائے یہ دیکھیں کہ اس کے ذریعے کیا اہم کارنامے انجام پائے۔حالی نے لکھا ہے کہ اس کانفرنس کے نتائج امید اور توقع سے زیادہ بہتر سامنے آئے۔اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ایک ساتھ ملتے ،اہم مسائل پر گفتگو کرتے اور احساس کمتری سے نکلنے میں کامیاب ہوتے۔اس کے اجلاس کی وجہ سے تعلیم کا خیال تیزی سے پھیلنے اور قبول کیا جانے لگا۔خاص طور سے اس شہر میں جس میں اجلاس منعقد ہوتا۔اس کے پیسوں سے غریب مسلم طلبہ کو تعلیمی وظیفہ دیا جاتا۔اس سے کئی عمدہ رسالے جاری کیے گئے ،مختلف جگہوں پر ڈپٹی نذیر احمد،نواب محسن الملک اور سید محمود وغیرہ کے لیکچر کروائے گئے اور متعدد مضامین لکھوائے گئے، بالخصوص مسلمانوں پر لگائے گئے سنگین الزامات کے جواب میں جیسے: 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'،'الجزیہ'،'کتب خانہ اسکندریہ'،'حقوق الذمیین'،'مسلمانوں کی ترقی وتنزلی کے اسباب'،'اشاعت اسلام بلا استعانت'،'ابوریحان بیرونی کی لائف'،اور کتاب 'کلیلہ دمنہ کے تاریخی حالات' وغیرہ۔اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ پبلک اسپیکنگ کی لیاقت میں اضافہ ہوا اور کئی مقررین ابھر کر سامنے۔

اس کانفرنس نے الہ آباد یونیورسٹی سے ''کاکس ہسٹری'' جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین پڑھائے جاتے تھے، ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کروایا۔جب اسی یونیورسٹی میں زور شور سے یہ تحریک چلی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کی جائے ،تو کانفرنس کے وفد نے یہ کہہ کر اسے رکوایا کہ اس سے مسلمانوں کی شکنی ہوگی، ہندوستانی تہذیب کو نقصان پہنچے گا اور اردو زبان کو بھی اس سے نقصان ہوگا۔کانفرنس کی تجویز پر نواب وقار الملک نے گورنمنٹ کے سامنے یہ مانگ رکھی کہ سرکاری اسکولوں میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے، چنانچہ گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے بعض شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی۔

اس کانفرنس کی ایک نتیجہ خیز تجویز اس وقت سامنے آئی جب 1892 میں دہلی میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں علی گڑھ محمڈن کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بک نے تعلیمی مردم شماری کی تجویز پیش کی تھی۔اس میں یہ معلوم کرنا تھا کہ: (1) جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلواتے ان کی تعداد کتنی ہے؟ اور وہ اپنی اولاد کو تعلیم کیوں نہیں دلواتے ؟ (2) کیا وہ مذہبی خیالات کی وجہ سے تعلیم نہیں دلواتے ؟ یا ان کے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے پیسے نہیں ہیں؟ (3) یا کیا وہ اپنی اولاد کو محض بے پروائی اور سہل پسندی کی وجہ تعلیم نہیں دلواتے ؟ اگر بچوں کو تعلیم نہ دلوانے کی وجہ تیسری ہے، تو والدین کو اپنی اولاد کی تعلیم پر متوجہ کیا جائے ،ان سے اس غرض کے لیے خط وکتابت کی جائے اور سمجھانے کے لیے لائق آدمی بھیجے جائیں۔چنانچہ اس کی کوششیں ہوئیں اور خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہوا۔

علی گڑھ تحریک کا دوسرا مقصد، مذہبی اور عقلیت پسندی:

علی گڑھ تحریک کا دوسرا مقصد مذہبی تھا۔اس کے تحت نئے علوم کی روشنی میں مذہب کی تشریح وتوضیح اور مسلمانوں میں رائج اوہام پرستی کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔سرسید کے عہد میں مذہب صرف حصول ثواب کا وسیلہ بن گیا تھا۔مذہب کا بنیادی نصب العین اور اخلاقی مقاصد غیر اہم ہو کر رہ گئے تھے۔ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور نے ذہنوں کو پراگندہ کر رکھا تھا، سرسید نے اسلام کی محرک قوتوں سے کام لینے کی کوشش کی۔انھوں نے غیر منطقی دلائل کے بجائے عقل سلیم کے ذریعے نہ صرف اسلام کی مدافعت کی بلکہ منطقی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو قبول بھی کرتا ہے اور یہ اپنے اندر جدید مسائل کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

چنانچہ فقہ اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے اسلام کی تفہیم میں عقلی نقطۂ نظر بھی استعمال کیا اور اس کی حقانیت کو بھی ایک نیا ثبوت فراہم کر دیا۔مذہبی علماء نے ملک پر قابض انگریزوں کی مخالفت میں انگریزی تعلیم کو مذہب مخالف قرار دے رکھا تھا۔انھیں یہ بھی خوف تھا کہ انگریزی تعلیم

اسلامی نظریوں اور مذہب کی روح کو مسخ کر دے گی۔ سرسید نے ثابت کیا کہ انگریزی تعلیم اسلامی نظریات پر اثر انداز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی مذہب کی روح کو کوئی نقصان پہنچائے گی، بلکہ اس سے مذہب کی تفہیم میں مدد لی جاسکتی ہے۔

یوں سرسید نے اسلام کی فکری جہت کو ابھارنے اور اس کی اصل روح کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے سرسید کے مذہبی افکار سے نہ صرف داخلی قوت حاصل کی بلکہ تنگ نظری، تعصب، اوہام پرستی اور انتشار کو بھی کم کیا۔ اس کے علاوہ اس تحریک نے مسلمانوں کے جملہ اختلافات ختم کرنے اور انھیں ایک متحدہ قوم بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کا تیسرا مقصد، علمی اور ادبی:

اس کے تحت نہ صرف اردو زبان وادب کا فروغ پیش نظر تھا بلکہ اسلوب بیان اور معانی کی ترسیل پر بھی بطور خاص توجہ دی جارہی تھی۔ شعروادب کی مختلف اصناف اور تنقید بھی اس کی حدود میں شامل تھیں۔ اس تحریک نے سطحی جذباتیت کو فروغ دینے کے بجائے گہرے تعقل، تدبر اور شعور کو پروان چڑھانے میں نمایاں کارکردگی کی۔ سائنسی نقطۂ نظر اور اظہار کی صداقت کو اہمیت دی۔ غیر شخصی اسلوب کو مروج کیا اور سادہ بیانیہ نثر کے استعمال پر زور دیا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک نے ادبی سطح پر اردو نثر کا ایک باوقار، سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا اور اسے شاعری کے مقفیٰ اور مسجع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی کشادہ ڈگر پر ڈال دیا۔ سرسید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''

یہ صحیح ہے کہ سرسید نے طرز ادا پر معانی کو فوقیت دی ہے لیکن انھوں نے انشا کے بنیادی تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے اپنے رفیقوں کو پیرایۂ بیان میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اسلوب سے متاثر کرنے کی تلقین کی ہے۔

علی گڑھ تحریک نے ادب میں زندگی کے جمال کو پیش کرنے کے مقابلے مادی قدروں کی اہمیت پر زور دیا۔ اور ادب کو بے غرض مسرت کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار دیا جس میں زندگی کو بدلنے اور اسے ترقی کی طرف گامزن رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علی گڑھ تحریک کو ۱۹۳۶ میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا پیش خیمہ اور سرسید کو احمد خاں کو سب سے پہلا ترقی پسند ادیب اور نقاد کہنا شاید غلط نہ ہوگا۔ کہ علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کے عہد طفولیت میں ہی اس کی عملی حیثیت کو قبول کیا اور سرسید نے ادب کو عین زندگی بنادیا جس کی وجہ سے اُسی زمانے میں ادب کی افادی اور مقصدی حیثیت ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

سیرت وسوانح اور تاریخ۔

علی گڑھ تحریک نے قومی زندگی میں جو ولولہ پیدا کیا تھا اسے بیدار رکھنے کے لیے سوانح اور سیرت نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی۔ خود سرسید احمد کی 'خطبات احمدیہ'، ڈپٹی نذیر احمد کی 'امہات الامۃ'، حالی کی 'حیات سعدی' حیات جاوید، یادگار غالب، اور شبلی نعمانی کی 'الفاروق اور المامون وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ساتھ ہی اس تحریک نے قومی اور ملی تاریخ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن تاریخ کو سپاٹ بیانیہ بنانے کے بجائے اس میں فلسفے کی آمیزش کی گئی تاکہ تاریخ کے صفحات میں سماج اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ رہے۔ جس کا آہنگ دریافت کر لینے کے بعد مستقبل کو سنوارا اور ارتقاء کے تسلسل کو برقرار رکھا جاسکے۔ اسی لیے سرسید نے آئین اکبری، توزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی دوبارہ مرتب کی، مولوی ذکاءاللہ نے 'تاریخ

ہندوستان' تالیف کی اور شبلی نے 'سیرۃ النبی، الفاروق اور 'اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر' جیسی کتابیں لکھیں۔علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے لیے زبان کا ایک معیار بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص افسانوی بیان پر سادہ بیانیے کو ترجیح دی گئی، شخصی تعصّبات کے مقابلے میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا اور تاریخی کرداروں کو اساطیری روپ دینے کے بجائے اس کی اصلی پیش کش کو اولیت دی گئی۔ یوں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ابتدائی زمانے میں ہی علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے لیے ایک معیار متعین کیا اور اس فن کے لیے ایک مخصوص اسلوب بھی وضع کیا۔

شاعری:

سرسید شاعری کے مخالف نہ تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ روایتی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔اس کے مقابلے میں وہ نیچرل شاعری کی وکالت کرتے تھے، اور غزل کے برعکس نظم کو پسند کرتے اور اسے رواج دینے کے خواہشمند تھے۔سرسید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری زبان کے علم وادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔شاعروں نے اپنی ہمت عاشقاں غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ وکہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔'' (مقالات سرسید، حصہ دہم، ص 120)

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھیں شاعری پر نہیں بلکہ شاعری میں بیان کیے گئے خیالات پر اعتراض تھا۔غزل میں عاشقی کے مضامین، قصیدے میں محض تعریفیں اور مثنوی میں صرف قصہ کہانی کے وہ قائل نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ شاعری کی ان اصناف سے مقصدی اور افادی کام لیے جائیں۔حالی نے اس حوالے سے 'مقدمہ شعروشاعری' میں مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے۔جس سے حالی کے یہاں سرسید کے تنقیدی خیالات کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔سرسید شاعری میں قافیہ اور ردیف کی پابندی کو بھی جذبات واحساسات کے اظہار اور خیالات کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ قرار دیتے تھے۔اس کے مقابلے میں وہ قافیہ سے آزاد نظم کی تخلیق پر زیادہ زور دیتے تھے۔اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ردیف قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔اِن باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہیں بلکہ غیر مفید بھی ہے۔'' (مقالات سرسید، حصہ دہم، ص 120)

دیکھا جائے تو جدید نظم کے تشکیلی دور میں ہی علی گڑھ تحریک نے فطرت نگاری کا رجحان پیدا کیا اور مروجہ قواعد سے انحراف کر کے خیالات کے بے روک بہاؤ کی راہ ہموار کی۔

تنقید:

علی گڑھ تحریک سے پہلے اردو تنقید صرف تذکروں، تقریظوں اور ذاتی تاثرات تک محدود تھی۔سرسید پہلے شخص ہیں جن کا تنقیدی شعور بالیدہ تھا۔ وہ جس طرح زبان کی سادگی اور الفاظ کی تاثیر پر زور دیتے تھے اسی طرح ادب کو بھی زندگی کا آئینہ اور شخصیت کا اظہار کہتے تھے۔انھوں نے ادب پر عملی اور نظری دونوں زاویوں سے تنقید کی۔سرسید کے تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔انھوں نے تنقید کی باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں لکھی، نہ ان کے تنقیدی نظریات کو کسی نے مرتب کرنے کی کوشش کی۔لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین سے ان کے خیالات کو ترتیب دے کر تنقید کے اصول ونظریات پر مبنی ایک عمدہ کتاب وجود میں لائی جاسکتی ہے۔سرسید کی سوانح اور ان کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے بحیثیت ادیب ادب کو تنقید حیات کا فریضہ انجام دینے پر مامور کیا، اور نقاد کی حیثیت سے انھوں نے ادب کی تنقید کے کچھ ہم اصول اور نظریات وضع کر کے اپنے رفیقوں کو اس کے تحت لکھنے پر آمادہ کیا۔سرسید کی اس دَن لکھی بوطیقا یا یوں کہیے کہ ان کے تنقیدی خیالات سے ان کے دو رفیقوں خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے بطور خاص استفادہ کیا۔علی گڑھ تحریک نے تنقید کے جس نظریے کو فروغ دیا اس میں ہیئت کے بجائے مواد کو زیادہ اہمیت حاصل

ہے۔یایوں کہیے کہ الفاظ کی رعنائی کے مقابلے میں مفہوم کی ترسیل کو ترجیح دی گئی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر نہ صرف علی گڑھ تحریک کے لیے بلکہ اردو زبان کو بھی ایک ایسی بوطیقا فراہم کردی جس کی مشرقی تنقید میں آج تک اہمیت مسلّم ہے۔اس کتاب میں سرسید کے تنقیدی نظریات کی کرنیں جگہ جگہ روشنی بکھیرتی نظر آتی ہیں۔''مقدمہ شعرشاعری ''حالی کی نظری تنقید کا لافانی نسخہ ہے،تو ''یادگار غالب'' کو اُن کی عملی تنقید کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔علامہ شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات حالی کے نظریات سے مختلف ہیں۔ان کی نظری اور عملی تنقید کے بہترین نمونے ''شعرالعجم ''اور ''موازنۂ انیس ودبیر'' ہیں۔

تراجم:

سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اس مقصد سے کیا تھا کہ ہندوستانی عوام،خاص طور سے مسلمان جو نئے اور عصری علوم سے محروم ہیں انھیں کارآمد اور مفید علوم سے تراجم کے ذریعے واقف کرایا جاسکے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ جو لوگ محدود علم کی وجہ سے ایک طرح کی بے بضاعتی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں وہ باوقار اور ترقی یافتہ زندگی گزار سکیں،اور کسی سے کسی طور پیچھے نہ رہیں۔سوسائٹی نے تراجم میں جن باتوں کا خاص طور سے خیال رکھا وہ یہ ہیں:

1۔ان مفید کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جو انگریزی یا یوروپ کی کسی اور زبان میں ہیں۔

2۔ترجمہ سادہ،آسان اور سہل زبان میں کیا جائے،جسے سمجھنے میں عام آدمی کو کوئی الجھن یا پریشانی نہ ہو۔

3۔مذہبی کتابوں کے ترجمے بالکل نہ کیے جائیں،تاکہ نہ تو کسی کی دل آزاری ہو اور نہ ہی کوئی اختلافی صورت حال پیدا ہو۔

4۔ایشیا کی قدیم،کارآمد اور کمیاب کتابوں کو دریافت کر کے شائع کرنا۔

اسی کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی حالات ومسائل سے مسلمانوں کو باخبر رکھنے کے لیے،اور ہندوستانیوں کے خیالات وجذبات سے حکومت کو آگاہ کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا۔انگریزی میں اس اخبار کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔یہ اخبار اس طرح شائع ہوتا تھا کہ اس کے ایک صفحے پر دو کالم ہوتے تھے۔ایک کالم میں اردو عبارت ہوتی تھی اور دوسرے کالم میں انگریزی کی عبارت۔کچھ دنوں بعد یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔اس اخبار کا ایک مقصد اردو اور انگریزی کی ہم آہنگی کے ذریعے دونوں قوموں میں اتحاد ویگانگت پیدا کرنا بھی تھا۔اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سرسید خود نبھاتے تھے۔

علی گڑھ میں 6 جون 1864 کو سائنٹفک سوسائٹی کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ کن کن کتابوں کے ترجمے کئے جائیں گے اور کون سی کتابیں تالیف کی جائیں گی۔اسی کے ساتھ سوسائٹی نے اس بات کا بھی اہتمام کیا تھا کہ جدید سائنس کے عملی نتائج سے بھی عوام کو روشناس کرایا جائے۔جن کتابوں کو ترجمے کے لیے منظور کیا گیا تھا ان کی فہرست طویل ہے۔یہاں ان میں سے کچھ کے نام دیے جاتے ہیں:

1 رسالہ بھاپ کے کلوں کے بیان میں؛مصنفہ ڈبلیو۔جے۔ایم کورین کاہن صاحب۔

2 رسالہ یوروپ کے آلات کاشت کاری کے بیان میں؛جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جاوے۔

3 رسالہ جیالوجی،یعنی اس علم کا جس میں انقلابات زمین کا بیان ہے،معہ بہت سی تصویروں کے؛مصنفہ جان فلپس صاحب۔

4 رسالہ علم طبیعات،جو نہایت پسندیدہ اور آزمودہ ہے؛مصنفہ جے۔جے۔گریفن صاحب۔

5 پولیٹیکل اکانومی،یعنی انتظام مدن؛مصنفہ سینیر صاحب۔

6 ایک مختصر رسالہ یوروپ کے علوم وفنون کے بیان میں،جو مانڈ صاحب کے خزانۂ علم سے تالیف کیا جاوے گا۔

7 رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی،جو اور صاحب کے دائرۂ علوم میں سے لیے جاویں۔

8 پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب، آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی اور دولت کے بیان میں ہے۔

9 رسالہ در باب سڑک ریل۔

10 مشہور زندہ لوگوں کے حیات نامے، جن کا انتخاب اس کتاب سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام سے مشہور ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے چند اہم اراکین:

علی گڑھ تحریک کو جن لوگوں نے ابتدائی زمانے میں اپنے خون جگر سے سینچا، جی جان سے اس کی آبیاری کی اور تن من دھن اس پر نثار کیا دراصل سرسید اور ان کے وہ رفقاء ہیں جن کی دوستی، رفاقت، علمی اور ادبی صلاحیتیں اور ایثار و محبت کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ان میں سرسید کے علاوہ نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور وحید الدین سلیم بطور خاص اہم ہیں۔

سر سید احمد خاں:

نواب محسن الملک:

نواب محسن الملک سرسید کے سب سے بڑے مداح تھے۔ شروع میں یہ سرسید کے مذہبی نظریات اور ان کے قومی ارادو سے مکمل اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن جب وہ سرسید کے حلقہ بگوش ہوئے اور انھیں قریب سے دیکھا تو اپنی ذات کو سرسید کی تحریک میں پوری طرح سے ضم کر دیا۔ سرسید کے رابطے میں آنے سے پہلے محسن الملک اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ مالی اور فوجداری قانون سے متعلق ان کی دو کتابیں آ چکی تھیں، جب ان کی کتاب 'مولود شریف' شائع ہوئی تو عوام میں انھیں کافی شہرت ملی، ادبی حلقوں میں وہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی بھی نواب محسن الملک کی طرح اردو کے نامور مصنفین میں نہ تھے۔ لیکن مذہب اسلام کے سچے خادم اور حامی تھے۔ انیسویں صدی میں جب نئے افکار و نظریات سے مغلوب لوگوں کی جانب سے اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جا رہے تھے اس وقت مولوی چراغ علی اعتراض کرنے والوں کے خلاف سینہ پر ہو گئے اور متعدد رسائل اور مضامین لکھ کر معترضین کو جواب دیے اور مذہب کی حقانیت کو ثابت کر دیا۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے سرسید کے مشن کا بھرپور تعاون کیا، ان کے موقف کی حمایت کی اور اس کی صراحت بھی۔ علی گڑھ تحریک کے افکار و نظریات کو انھوں نے اس خوبی اور خوبصورتی سے پھیلایا کہ یہ لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گئے۔

نواب وقار الملک

نواب وقار الملک اردو کے باقاعدہ مصنف نہیں تھے لیکن انھوں نے مذہبی، اخلاقی، قومی اور معاشرتی مسائل کے موضوعات پر بہت سے مضامین تحریر کیے۔ انھوں نے غالب کے شخصی اور سرسید کے سائنسی اسلوب کو ملا کر ایک انوکھے انداز کا اسلوب وضع کیا تھا۔ اور غالب کی طرح ہی نجی گفتگو کو ذاتی اظہار کا ادبی وسیلہ بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ کالج کے بغیر مسلمان ترقی نہیں کر سکتے اس لیے وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے عملی طور بے حد مصروف رہے۔ اور علی گڑھ تحریک کو پروان چڑھانے میں ہر ممکن اپنا تعاون پیش کیا۔

خواجہ الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار علی گڑھ تحریک کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کے متعدد اصناف کو برتا اور ان پر گہرا اثر ڈالا۔ یوں تو حالی کی بنیادی شناخت غزل کے شاعر اور شاعری کے نقاد کی ہے لیکن علی گڑھ تحریک کے زیر اثر انھوں نے مسدس لکھی، غزل گوئی کی نئی روایت قائم کی اور

کئی بے حد عمدہ اور اہم سوانح لکھی۔ 'یادگار غالب'، حیات جاوید اور 'حیات سعدی' ان کے زندہ جاوید کارنامے ہیں۔ حالی کو سب سے زیادہ شہرت ان کی بے مثل تصنیف ''مقدمہ شعروشاعری'' سے حاصل ہوئی۔ یہ کتاب لکھ کر حالی نے اردو شاعری کو تنقیدی اساس فراہم کی اور اردو زبان کو تنقید کی ایک ایسی بوطیقا عطا کی جس پر اردو تاریخ جتنا ناز کرے کم ہے۔

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی نے علی گڑھ تحریک کو حد درجے وسعت بخشی۔ انھوں نے صرف علی گڑھ تحریک اور سرسید سے ہی روشنی حاصل نہیں کی بلکہ وہ خود بھی روشنی کا مینار تھے۔ علی گڑھ تحریک کی فکری جہت کو شبلی نے بنیادی اساس فراہم کی اور اسے مستحکم کرنے میں اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا بے محابہ استعمال کیا۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ مورخ، محقق، شاعر، نقاد، سوانح نگار، سیرت نگار، ادیب، خطیب، فلسفی، متکلم اور انشا پرداز تھے۔

شبلی نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا پوری ذمے داری، تحقیق اور دلائل کے ساتھ لکھا۔ اسلام، مسلمان، علماء اور قومی تاریخ پر مستشرقین کی جانب سے عائد کیے گئے متعدد الزامات کے جواب جس سنجیدگی، سلیقے اور سائنٹفک طریقے سے شبلی نعمانی نے دیے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے عقائد کا نہیں بلکہ عقلی دلائل کا استعمال کیا ہے اور اختلافِ مذاہب کے سیاسی اسباب تلاش کیے ہیں۔ انھوں نے علمی، ادبی اور تاریخی مباحث کو اپنے منفرد دلائل اور آزاد تفکر سے سلجھایا ہے، اور الکلام، علم الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم وغیرہ جیسی کتابیں تحریر کر کے جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر اور مقالات شبلی ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ شبلی کی انفرادی خوبیاں اور ان کے ادبی کمالات تسلیم مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی انفرادیت کو تخلیقی جہت علی گڑھ تحریک نے عطاء کی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد سرسید کے حلقے میں سب سے بعد میں شامل ہوئے۔ ان کی ذہن سازی اور شخصیت کی تعمیر قدیم دلی کالج کی مرہون منت ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ انھوں نے چونکہ سماجی اور معاشرتی مسائل کو قصہ کہانیوں کے فارم میں پیش کیا اس لیے ان کا تاثر گہرا، دوررس اور حلقۂ اثر کافی وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ایسی اصلاحی تدبیروں کو فوقیت دی ہے جن سے مسلمان زمانے سے ہم آہنگ ہوسکیں اور ترقی کی دوڑ میں ہم وطنوں کا مقابلہ کرسکیں۔ مرأۃ العروس، توبۃ النصوح، ابن الوقت، ایامیٰ، بنات النعش وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔

اس کے علاوہ نذیر احمد نے تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ کیا، اسلامی فقہ کو نئے اصولوں کے مطابق مرتب کیا اور قران شریف کا دہلی کے ٹھیٹھ محاوراتی اردو ترجمہ میں کیا۔ علی گڑھ تحریک کو علی گڑھ اور محض ایک علاقے یا ایک صوبے تک محدود نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے ملک گیر وسعت دی اور ملک سے باہر تکا سے پھیلانے کی کوشش کی۔

منشی ذکاءاللہ

منشی ذکاءاللہ کا شمار علی گڑھ تحریک کے کثیر التصانیف مصنفوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر کتابیں اور مضامین تحریر کیے جن پر پہلے کسی اور نے نہیں لکھا تھا۔ سرسید کی طرح منشی ذکاءاللہ نے بھی مسائل و موضوعات کو سائنسی انداز میں پیش کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کا پیغام بچوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے درسی کتابیں تیار کیں، اردو میں ریاضی اور سائنس کی کتابیں لکھیں اور سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر متعدد مضامین اور مقالات تحریر کیے۔ ان کی تصانیف میں تاریخ ہندوستان (دس جلدوں میں) تاریخ انگلیشیہ، سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، سوانح مولوی سمیع اللہ اور کرزن نامہ وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے تمام رفقاء میں سرسید کا اثر سب سے زیادہ منشی ذکاءاللہ نے قبول کیا تھا۔ اس حوالے یہ بات ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ علی گڑھ تحریک کے مقاصد اور اس کے نظریات کو وسعت دینے میں منشی ذکاءاللہ ایک ایثار پیشہ رفیق کی طرح دل و جان سے مصروف رہے۔

خلاصۂ کلام:

علی گڑھ تحریک کے مجموعی کام کو دیکھا جائے تو اس میں شخصیت سازی، مثبت رجحان کے فروغ، حالات ومسائل سے آگاہی اور درست فیصلے کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔ زمانے کے تقاضوں، سماجی حالات اور قوم کی ضرورتوں کو شدت سے محسوس کیا گیا اور انھیں پورے کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تعلیم کو عام کرنے کے لیے ادارے قائم کیے گئے اور لوگوں کی ذہن سازی کے لیے مختلف رسائل وجرائد نکالے گئے۔ تصنیف وتالیف کے حوالے سے اس میں ایک تازگی اور جدت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ زبان کو آرائش وزیبائش سے پاک کر کے سادہ، آسان اور زیادہ قابل فہم بنایا گیا۔ تراجم کے ذریعے دوسرے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ شعروادب اور تنقید میں مقصدیت وافادیت پسندی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی کیف کا واضح طور پر خیال رکھا گیا۔ توہمات کو ختم کیا گیا۔ مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ قدامت پرستی پر جدیدیت کو اور دقیانوسیت پر عقلیت پسندی کو ترجیح دی گئی۔ اور ایک خوشگوار، کامیاب اور باوقار زندگی کے لیے تمام تر مواقع اور اسباب مہیا کیے گئے۔

☆☆☆

اکائی۱۱ ترقی پسند تحریک

ساخت:

1.0 ترقی پسند تحریک کے اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2 ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا پس منظر و پیش منظر

1.2.1 آغاز اور ابتدائی دور

1.2.2 تحریک کا ارتقا اور عروج

1.3 ترقی پسند شاعری

1.4 ترقی پسند ادب

1.5 خلاصہ

1.6 نمونۂ امتحانی سوالات

1.7 مزید مطالعہ کے لیے نام زد کتابیں

1.0 اغراض ومقاصد:

جس طرح معاشرتی تحریک معاشرے کے جمود کو توڑتی ہے اسی طرح ادبی تحریک اس ادب میں تحرک پیدا کرتی ہے جس میں یکسانیت اور تکرار پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ بس ادبی تحریک ادب کے جمود کو توڑنے اور اس کی کہنگی کو ختم کر کے اس میں نئے خیالات ونظریات کی کے تحت ادب خلق کرنے کا عمل ہے۔ ترقی پسند تحریک سے متعلق اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ مندرجہ ذیل باتوں سے واقف ہو جائیں گے:

- ادب میں تحریکات کی کیا اہمیت ہے اور اس سے ادب کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔
- ترقی پسند تحریک کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس سے اردو ادب کو کیا حاصل ہوا۔ آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ یہ واقعہ اردو ادب کی تاریخ میں کیسے اور کتنا اہم ثابت ہوا۔
- ترقی پسند تحریک کے مثبت ومنفی اثرات کس طرح ہمارے ادب پر مرتب ہوئے۔
- اس تحریک نے اردو شعر و ادب کے تمام اصناف کو حیرت انگیز طور پر متاثر کیا۔ ادب کی تخلیق میں جب تک متوازن رویہ اختیار کیا جاتا رہا تب تک ادب کی مرکزیت برقرار رہی، لیکن جیسے ہی اس کے توازن میں کمی آئی

اور پیش کش میں تکرار و یکسانیت کا عنصر حاوی ہوا ادب ثانوی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔

- ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور ارتقا کے مراحل کس طرح طے ہوئے۔

1.1 تمہید:

حرکت جمود کے مخالف عمل کا نام ہے۔ یہ عمل ہمیشہ جمود کی پرانی حالت کو توڑ کر کسی نئی حقیقت کو وجود میں لاتا ہے ۔اس بات سے ہم واقف ہیں کہ علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس نے اردو شعر و ادب کا مختلف زاویے سے مطالعہ کیا اور ان رجحانات کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا۔ ہماری زبان میں شعر و ادب کا وافر ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے نام سے ہمارے ملک میں یہ تحریک ۱۹۳۵ء میں شروع ہوئی۔ اس تحریک نے نہ صرف پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا وسیلہ بن گئی۔

ہندوستان میں سماجی و سیاسی بیداری کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہی ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد اصلاحی تحریکیں رونما ہو رہی تھیں جن کے مطالعے سے ایک نئی فکر اور نئے زاویۂ نگاہ کی کلبلاہٹ کا ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھی ایسی سرگرمیاں تیزی سے پروان چڑھ رہی تھیں مثلاً پہلی جنگ عظیم کے اثر سے پیدا مسائل، ۱۹۱۷ء کا روس کا انقلاب ایک اہم واقعہ ہے جس نے اشتراکیت کی بنیاد رکھ دی۔ یہی وہ شعور تھا جس کا اثر بیسویں صدی کے ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس شعور نے جب زور پکڑا تو تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے اردو میں ہم ترقی پسند تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔

1.2 ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا پس منظر و پیش منظر:

ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز بین الاقوامی حالات کے اس پس منظر میں ہوا جب آہستہ آہستہ سماجی اور سیاسی مسائل ملکی سرحدوں سے نکل کر بین الاقوامی سرحدوں میں داخل ہونے لگے۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم۔ ۱۹۱۷ء میں روس کا کامیاب اشتراکی انقلاب جس کا اثر عوامی تحریک کی شکل میں ساری دنیا پر پڑا۔ لیکن ہندوستانی زندگی اور ادب پر ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے سانحے نے شدید اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی کہ جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی گئی۔ پہلی بار دنیا کے سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہوئے۔ اس کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ ادیب کو اپنے ذاتی خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد کے تحفظ اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۳۴ء میں لندن کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے

والے ہندوستانی نوجوانوں کا ایک گروپ ایک ریسٹورنٹ میں جمع ہوا اور ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی۔ یہ گروپ رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتا جارہا تھا جس نے ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ یہ حضرات سجاد ظہیر کے کمرے میں ملتے بحثیں کرتے۔ سجاد ظہیر نے تو اپنے ہم خیال ادیبوں احمد علی، محمود الظفر اور اہلیہ رشید جہاں کے ساتھ مل کر ۱۹۳۲ء میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ ''انگارے'' شایع کیا۔ ان کہنیوں کے موضوعات اور بیان میں ایسی تیزابیت تھی کے ہندوستانت معاشرے نے اسے قبول نہیں کیا اور یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ احتجاج کی اسی لے نے ان حضرات کے ذریعے آگے چل کر ہندوستان میں ایک انجمن کی تشکیل کرائی اور اس کا نام انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشنز کھا گیا (Indian Progressive Writers Association) اور ملک راج آنند اس کے صدر مقرر کیے گئے۔ انجمن کا منشور لندن ہی میں تیار ہوا اس کی نقل سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں کو بھیجی۔ ۱۹۳۵ء میں ہی ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی، اور منشی دیانارائن نگم سے ملاقات کی۔ ان ادیبوں اور دانشوروں نے مینی فیسٹو کے مقاصد سے اتفاق کیا اور اس پر دستخط کیے۔ اس مینی فیسٹو میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں وہ اس طرح تھیں۔

- ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قایم کرنا
- ان ادبی جماعتوں سے میل ملاپ پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں
- ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا، صحت مند ادب کا ترجمہ کرنا جس سے ہم تہذیبی پس ماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانے آزادی اور سماجت ترقی کی طتف بڑھ سکیں
- ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا
- فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنا
- ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا، عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانا چاہتے ہیں

انجمن کے اغراض و مقاصد کو پریم چند نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شایع کرتے ہوئے ان کی حمایت میں لکھا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

1.2.1 آغاز:

ترقی پسند تحریک پہلی ایسی ادبی تحریک تھی جس میں مختلف زبانوں کے ادیب نظریاتی اتحاد کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے۔ ان ادیبوں کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں منعقد ہوئی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی منتخب کیے گئے۔ وہاں دیگر ادیبوں میں منشی پریم چند، حسرت موہانی، جے پرکاش

نارائن ،کملا دیوی چٹو پادھیائے ،میاں افتخار الدین اور یوسف مہر علی وغیرہ نے شرکت کی۔احمد علی، فراق گورکھپوری، محمود الظفر نے مقالے پڑھے اور متعدد لوگوں نے تقریریں کیں۔انجمن کا ایک دستور بھی منظور ہوااس کا مسودہ ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر ن مل کر تیار کیا تھا۔سجاد ظہیر کو انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا اور ان کو انجمن کا مرکزی دفتر الہ آباد میں قایم کرنے کا کام سپرد ہوا۔کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ بھی پیش ہوا۔اعلان نامہ میں یہ کہا گیا کہ ہندوستانی مصنفین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشونما میں حصہ لیں۔ آفاقی باتیں اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں اور ادب کو عوام کے دکھ سکھ اور جد و جہد کا وسیلہ بنائیں۔نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل بھوک ،افلاس ،سماجی پستی کو موضوع بنائے۔انجمن کے مقاصد اس طرح ہوں گے۔

- ☆ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا
- ☆ تنظیم سے متعلقہ لٹریچر شایع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا
- ☆ ترقی پسند مصنفین کی حیثیت سے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرنا
- ☆ رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدو جہد کی کوشش کرنا
- ☆ ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا
- ☆ آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا

اس اجلاس میں منشی پریم چند کا خطبہ سب سے زیادہ اہم تھا۔انہوں نے پہلے جلسے کی تاریخی اہمیت بیان کی لیکن پرانیادب پر تنقید کی اور نئے ادب کا مقصد واضح کیا۔انہوں نے کہا کہ ''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے.....ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔انہیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قایم تھی۔'' اور اس خطبہ کے آخری جملے ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو،آزادی کا جذبہ ہو،حسن کا جوہر ہو،تعمیر کی روح ہو،زندگی کی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے،سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' پریم چند نے اپنے اس خطبۂ صدارت کو ہندی میں ترجمہ کر کے رسالہ ہنس میں جولائی ۱۹۳۶ء میں شایع کیا۔

1.2.2 تحریک کا ارتقا اور عروج:

تحریک سے وابستہ شعرا اور ادیب جہاں کہیں جاتے اپنے رویے کی تشہیر کرتے۔بالخصوص پریم چند نے اتر پردیش کے علاوہ بہار، مدھیہ پردیش ،مہاراشٹر اور بنگال کے ادیبوں کو متوجہ کیا۔دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قایم کی۔مولوی عبدالحق کے علاوہ، ڈاکٹر عابد حسین ،مجاز اور جوش ملیح آبادی۔شاہد احمد دہلوی نے انجمن کے مقاصد کی

ترویج کے لیے ''شاہ جہاں'' نام کا رسالہ بھی جاری کیا۔ کان پور میں بھی انجمن بنی جس کے صدر مولانا حسرت موہانی منتخب ہوئے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں نے بھی ترقی پسند انجمنیں قائم کیں۔ کلکتہ، سلہٹ، گوہاٹی، ناگپور، پونا ،احمد آباد، مالا بار اور بیجواڑہ کے علاقوں میں بھی اس طرح کی انجمنیں مختلف زبانوں کی قائم ہوئیں۔ ادھر پنجاب میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہوئی جس کے روح رواں فیض احمد فیضؔ تھے۔ اس میں سجاد ظہیر، چراغ حسین حسرت، ڈاکٹر تاثیر، پروفیسر محبّ الحسن، رگھوونش کمار، رگھوپتی چوپڑا وغیرہ شامل ہوئے۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستان گیر حیثیت اختیار کر گئی۔ اسی موقع پر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور جا کر علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی۔ علامہ پہلے سے ہی ترقی پسند نظریات کے حامی تھے۔ فرمایا ''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہم دردی ہے، آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں''۔ مزدوروں کو مستعد ہونے کا پیغام جس شعر میں انہوں نے دیا ہے زبان زد خلائق ہے ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

۱۹۳۷ء میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس کی جس میں اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اور ترقی پسند سیاسی رہنما شریک ہوئے۔ مجلس صدارت میں اچاریہ نریندر دیو، پنڈت رام نریش ترپاٹھی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق اس میں شرکت نہیں کر سکے تھے لیکن انہوں نے اپنا خطبہ صدارت بھیج دیا تھا جسے پڑھ کر سنایا گیا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی جس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ اس کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ اردو، بنگالی گجراتی مراٹھی اور مختلف زبانوں کے ادبی رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس کانفرنس میں کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اس قدر مقبول ہوتی گئی کہ بنگالی زبان کے مشہور رسالے ''پریچے'' نے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات کو اہتمام سے شایع کیا۔ ادھر ترقی پسندوں نے خود اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ رسالہ ''نیا ادب'' بے حد مقبول ہوا اس کی مقبولیت سے حوصلہ پا کر نوجوان ادیبوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ 'حلقۂ ادب' کے نام سے قایم کیا سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات، حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت''، مجاز کا مجموعۂ کلام آہنگ، اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شایع کیے گئے۔ جوش ملیح آبادی اپنا رسالہ 'کلیم' بند کر کے نیا ادب کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ ''نیا ادب'' عروج پر تھا اسی زمانے میں ملک راج آنند ،ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں انگریزی ماہنامہ انڈین لٹریچر شایع کیا گیا۔ اس طرح ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند ادب کا بول بالا ہوا اور ان کی تحریریں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔

ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بین الاقوامی سیاسی حالات بہت نازک موڑ پر آ گئے تھے۔ ترقی پسند مصنفین جمہوریت کی تائید میں اور فاشزم کے خلاف اپنی آواز پہلے ہی اٹھا چکے تھے۔ اس کانفرنس میں حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ترقی پسند مصنفین سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ وہ لوگ ترقی پسند ادب کو پروپیگنڈہ کہتے تھے۔ اس پانچ سات برس کے عرصے میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں ایک خاص قسم کی کمی ضرور واقع ہوئی جس سے ان کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔ نتیجتاً ترقی پسندوں کے خلاف مضامین اور اس کے جواب میں وضاحتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کے خلاف اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات، نعرہ بازی اور فحاشی اور عریاں نویسی پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی اور اثر لکھنوی کے مضامین کے جواب احتشام حسین، سجاد ظہیر اور علی جواد زیدی نے دیے۔

۴۴۔۱۹۴۳ء کے قحط بنگال کو ترقی پسندوں نے اپنا موضوع بنایا اور جبر و ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ترقی پسندوں کی حیدر آباد میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اردو زبان و ادب کے مسائل پر تفصیلی بحث ہوئی۔ یہ کانفرنس پانچ دن تک چلتی رہی۔ اس میں اردو کے تقریباً تمام اہم ادیب موجود تھے۔ اس کا افتتاح سروجنی نائڈو نے کیا۔ ڈاکٹر تارا چند نے اردو ہندی کے اجلاس کی صدارت کی۔ فراق گورکھپوری نے شاعری کے اجلاس کی اور قاضی عبدالغفار نے صحافت کے اجلاس کی۔ مولانا حسرت موہانی نے عام اجلاس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کی سب سے اہم بات یہ تھی کے ڈاکٹر عبدالعلیم نے ادب میں فحاشی کے خلاف ایک قرارداد پیش کی، اس میں کہا گیا کے اردو ادب میں جو فحاشی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں اس کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب فحاشی کے خلاف ہیں اور اس کے اظہار کو ادب کے لیے غیر صحت منداور مضر سمجھتے ہیں۔ لیکن جب اس قرارداد کی قاضی عبدالغفار اور حسرت موہانی نے یہ کہ کر مخالفت کی کہ جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے بشرطیکہ لکھنے والے کا انداز تعمیری اور ترقی پسندانہ ہونا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی نے تو یہاں تک کہا کہ ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسنا کی کا اظہار کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بات پر وہ قرارداد مسترد ہو گئی۔

۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں ہوئے ہیبت ناک واقعات کچھ عرصے تک ترقی پسند مصنفین کے موضوعات رہے لیکن ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی کے پانچویں کل ہند کانفرنس میں اس ادبی حلقے نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور اپنے منشور میں وسعت دی۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی و سماجی مسائل کو موضوع بنایا لیکن ادبیت ختم ہونے لگی اور ادعائیت کی حد تک موضوع کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کے ادب جمود کا شکار ہوا اور بحث کا وضوع ادبی جمود بن گیا۔

1.3 ترقی پسند شاعری اور ادب:

ترقی پسند شاعروں نے انقلاب اور آزادی کو ہی اپنا محبوب قرار دیا تھا۔ ان کے انقلاب کا تصور رومانی تھا۔ وہ اکثر نظمیں اپنے محبوب کو مخاطب کر کے لکھتے تھے۔ اس سے معذرت کرتے تھے کے ان کے پاس محبت سے زیادہ اہم کام ہیں اس لیے وہ محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ترقی پسند شعرا میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، شمیم کرہانی، شاد ملیح آبادی، سلام مچھلی شہری، معین احسن جذبی، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، فراق گورکھپوری، منیب الرحمٰن، قتیل شفائی احمد ندیم قاسمی وغرہ کے نام اہم ہیں۔ ترقی پسند شاعروں نے فرسودہ نظام کو ختم کرنے اور نئی دنیا تعمیر کرنے کے خواب دیکھے۔ ترقی پسند شاعری کے لیے جو شرطیں طے کی گئیں وہ اس طرح ہیں کہ شاعر غم دوراں کو موضوع بنائے۔ غم جاناں اور غم ذات کو موضوع بنانا رجعت پسندی ہے۔ شاعر انقلاب کی جدو جہد پر بین الاقوامی سیست پر نظر رکھے۔ جمالیاتی قدریں یا ہیئت کا تناسب وغیرہ رجعت پسند نقادوں کی اصطلاحیں ہیں۔ ادب میں اشاریت، رمزیت، استعارہ، تشبیہ، علامت زوال پسندوں کا رجحان ہے۔ غم، افسردگی، تنہائی، اور اداسی کا اظہار نا پسندیدہ ہے بلکہ شاعری کو امید افزا ہونا چاہیے۔ جو شاعر عالم گیر عوامی جد و جہد کو موضوع نہیں بناتا اس کا سیاسی شعور خام ہے۔ اس فارمولے کے زیر اثر جو شاعری کی گئی وہ یکسانیت کا شکار ہوگئی۔ دنیا کے ہر ملک کو موضوع بنایا گیا۔ نظموں میں لفظوں کی تکرار، مصنوعی رجائیت احساس اور جذبے کے فقدان نے شاعری کو پروپیگنڈہ بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح کی شاعری سے لوگ اوب گئے۔

افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خاطر خواہ ذخیرہ جمع ہوگیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ترقی پسند تحریک سے قبل افسانے میں دو واضح رنگ نظر آتے ہیں ایک حقیقت نگاری کا اور دوسرا رومانیت اور تخیل پرستی کا۔ ''انگارے'' کے مصنفین کے افسانے گویا ترقی پسند تخلیق کاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ افسانوی نثر میں جن ادیبوں کو خوب پذیرائی نصیب ہوئی ان میں کرشن چندر، شعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بید یعصمت چغتائی وغیرہ کے نام اہم ہیں اسی طرح ناول اور دوسرے نوع کی تحریروں میں بیشتر ہی ادیب پیش پیش رہے جنکے نام گذشتہ صفہات میں کثرت سے آئے اور اس تحریک کے بنیاد گزاروں میں تھے۔

1.4 خلاصہ:

۱۹۳۴ء میں لندن میں زیر تعلیم نوجوانوں کے ایک گروہ نے انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ نوجوان سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر تھے۔ انہوں نے ادب کے لیے ایک منشور بنایا اور اپنے دوستوں کو ہندوستان بھیجا۔ پریم چند نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں یہ مینی فیسٹو شایع بھی کیا۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر ہندوستان وَئے تو انہوں نے ادیبوں کا ایک حلقہ بنالیا۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ

میں ہوئی۔اس موقع پر پریم چند نے ایک یادگار خطبہ دیا۔انہوں نے اپنے خطبہ میں حسن کا معیار بدلنے پر زور دیا۔اس کے علاوہ ایک اعلان نامہ بھی جاری کیا گیا جس میں یہ تلقین کی گئی کہ بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ ۱۹۳۸ء میں دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں بلائی گئی۔دو تین سال میں ترقی پسندوں کی تحریک پورے ملک میں مقبول ہوگئی۔ترقی پسندوں نے اپنا رسالہ ''نیا ادب ''لکھنؤ سے نکالا۔ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں ماہنامہ ''انڈین لٹریچر'' شایع کیا تیسری کل ہند کانفرنس ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی اس میں فاشزم کے خلاف ایک قرارداد پاس کی گئی۔ چار پانچ سال میں جس طرح کا ادب لکھا گیا اس کی تعریف تو ہوئی لیکن تنقید بھی ہوئی۔ مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی اب اس کی مزید تنظیم ضروری نہیں۔

1.5 مزید مطالعہ کے لیے نامزد کتابیں:

۱۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
۲۔ ترقی پسند ادب	عزیز احمد
۳۔ ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری
۴۔ روشنائی	سجاد ظہیر
۵۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	ڈاکٹر منظر اعظمی
۶۔ اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید

○○○

اکائی ۱۲ حلقۂ ارباب ذوق

حلقہ ارباب ذوق کا تعارف:

عام طور سے حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند کو تحریک کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے، اور یہ کہ حلقہ ارباب ذوق کا رجحان ترقی پسند تحریک کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن تاریخی سچائی یہ ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی مضبوط تحریک کے متوازی حلقہ ارباب ذوق کا رجحان بھی پنپ رہا تھا، جس نے انتہائی مختصر عرصے میں ترقی پسندوں کی طرح سماجی اور معاشرتی جمود کو ختم کرنے کے بجائے شعروادب کے انجماد کو توڑنے کی راہ اختیار کی اور خارجی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ انسان کے پُراسرار باطن کی دریافت کا بھی فیصلہ کیا۔

یہ بات تو کسی حد تک درست ہے کہ تصورات ونظریات، داخلیت اور خارجیت، مادیت اور روحانیت اور ابلاغ وترسیل کے اعتبار سے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق میں واضح فرق موجود ہے، اور یہ بھی کہ ترقی پسندوں نے اجتماعیت کو اہمیت دی، حلقے نے انفرادیت کو۔ لیکن یہ بات قطعی درست نہیں ہے کہ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے ردعمل میں پیدا ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق ایک ہی عہد اور ایک ہی جیسے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس مئی 1936 میں منعقد ہوئی اور حلقۂ ارباب ذوق کا پہلا جلسہ یکم اکتوبر 1939 کو ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ترقی پسند تحریک ایک باضابطہ اور مکمل منصوبے کے تحت وجود میں آئی، اس کے مقاصد متعین ہوئے اور ادیبوں اور فنکاروں کے لیے تحریری دستور العمل یا منشور تیار کیا گیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے وجود میں آنے کا قصہ یہ ہے کہ:

> ''29 اپریل 1939 کو سید نصیر احمد جامعی نے اپنے چند دوستوں کو جن میں نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد اختر وغیرہ شامل تھے جمع کیا اور ایک ادبی محفل منعقد کی۔ اس محفل میں نسیم حجازی نے ایک طبع زاد افسانہ پڑھا۔ دوستوں نے اس افسانے پر باتیں کیں۔ ادبی خدمت کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ایک مجلس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور رسمی طور پر اس کا نام ''مجلس داستان گویاں'' رکھا گیا۔'' (شیر محمد اختر، چونتیسواں خطبۂ صدارت، سالانہ اجلاس، حلقہ ارباب ذوق، ص، 4-3)

گویا یہ کوئی منصوبہ بند تحریک نہیں ایک اتفاقی واقعہ تھا جو اپنے تسلسل اور اپنے شرکاء کے لگاتار غور وفکر کی بنا پر ایک طاقتور رجحان کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یوں بھی 'مجلس داستان گویاں' کا مقصد ادب میں کوئی انقلاب پیدا کرنا، موضوعات میں تبدیلی لانا یا ہیئت سے انحراف کرنا نہیں تھا۔ اس مجلس کا مقصد تو بس دوستوں سے ملاقات کے مواقع پیدا کرنا، اسی بہانے سے ایک دوسرے کی چیزیں سننا اور اس پر گفتگو کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مجلس بے سروسامانی کے عالم میں شہر کے الگ الگ حصوں میں الگ الگ دوستوں کے گھر منعقد ہوتی رہی۔ آٹھ نو نشستوں کے بعد اس کے شرکاء نے محسوس کیا کہ اس میں دوسری اصناف کے لکھنے والوں کی بھی شمولیت ہونی چاہیے۔ چنانچہ ''مجلس داستان گویاں'' کا نام تبدیل کر کے ''حلقۂ ارباب ذوق'' رکھا گیا۔ بعد میں اسی نام سے اس رجحان کو شہرت ملی اور اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں جگہ بھی۔

حلقہ ارباب ذوق کے اغراض ومقاصد اور طریقہ کار:

''حلقہ ارباب ذوق'' کے مصنف یونس جاوید نے لکھا ہے کہ اس کے اغراض مقاصد پہلے جلسے میں ہی طے پا گئے تھے۔ لیکن اغراض ومقاصد کا تعلق 'حلقے' کے تصورات ونظریات یا اس کے جلسوں میں پیش کی جانے والی تحریروں کی سمت کے تعین سے نہیں تھا، بلکہ اس کے اراکین کی تعداد میں

اضافے اور نشستوں کو کامیاب بنانے سے متعلق چند تجویزیں طے کی گئی تھیں جنھیں قواعد وضوابط یا اغراض ومقاصد کے طور پر لکھے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کئی برسوں کے بعد حلقے کے معروف شاعر قیوم نظر نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کے یہ اغراض ومقاصد بتائے تھے:

(1) اردو زبان کی ترویج واشاعت۔

(2) نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم وتفریح۔

(3) اردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت۔

(4) تنقید ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کرنا۔

(5) اردو ادب وصحافت کے ناسازگار ماحول کو صاف کرنا۔ (ماہ نو، کراچی، شمارہ، مئی 1972)

قیوم نظر کے بیان کیے ہوئے ان اغراض ومقاصد سے نہ تو حلقے کی بنیادی شناخت کا پتہ چلتا ہے نہ اس کے مزاج کا اظہار ہوتا ہے، نہ ہی ادبی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ حلقے کی بنیادی شناخت اور اس کے داخلی مزاج کا تعین دراصل حلقے کے طریق کار سے ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر محمد باقر نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کے مضمون ''یادداشت'' سے یہ انتخاب ملاحظہ فرمائیے:

(1) حلقہ ارباب ذوق کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوگا۔

(2) حلقہ ارباب ذوق کا صرف ایک مستقل سکریٹری ہوگا۔

(3) رکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس نہیں لی جائے گی۔

(4) ہر سال کے لیے ایک سکریٹری چنا جائے گا۔

(5) حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی اور حلقہ کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہیں حلقے کا رکن بنائیں لیکن حلقے کے اجلاس ہر اس مرد اور عورت کے لیے کھلے ہوں گے جن کو اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

(6) حلقے کا جلسہ ہر ہفتے ایک رکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمے سب کو چائے پلانا ہوگا۔

(7) حلقے کی ہر نشست میں کچھ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں گی جن کو سننے کے بعد ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ناراض ہونے کے بجائے خوشدلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید واعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔

(8) حلقے کی کاروائی کو حتی الوسع مشتہر نہیں کیا جائے گا۔ (ڈاکٹر محمد باقر، مخزن، اگست، 1950)

حلقہ ارباب ذوق کی جدت طرازی:

شروع شروع میں حلقہ ارباب ذوق کی حیثیت محض روایتی تھی۔ اس میں اچانک تبدیلی اور ایک نئی زندگی کا احساس تب ہوا جب اس 'حلقے' میں میراجی نے شمولیت اختیار کی۔ میراجی حلقے میں شامل ہونے سے پہلے رسالہ 'ادبی دنیا' میں مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ معاون مدیر تھے جہاں وہ ہیئت، موضوع اور خیال کے کئی تجربات کر چکے تھے اور انھیں ''ادبی دنیا'' کے صفحات کی زینت بھی بنا چکے تھے۔ وہاں میراجی کی نہ صرف ادبی تربیت ہو چکی تھی بلکہ انھیں شہرت وناموری بھی حاصل ہو چکی تھی اور شاعر وادیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنی اہمیت بھی تسلیم کروالی تھی۔ قیوم نظر نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ پہلے پہل وہی میراجی کو حلقے کے جلسے میں کھینچ لائے تھے۔ میراجی کے آنے سے حلقے کو اعتبار بھی حاصل ہوا اور اس کا دائرہ اثر بھی وسیع ہوتا گیا۔

میراجی نے 'حلقے' کی تنظیم میں دلچسپی لی اور اس کے پروگراموں کی ترتیب میں اہم رول ادا کیا۔ انھیں کے مشورے پر حلقے میں پڑھی جانے والی تحریروں کی خامیوں کی گرفت اور ان پر مباحثے کا آغاز ہوا۔ یوں حلقے نے اجتہاد اور جدیدیت کے سفر کی ابتدا کی۔ حلقے میں میراجی کے بنیادی کردار کی

وجہ سے حلقے کے اراکین اور شرکاء نے ان کی اہمیت تسلیم کی، ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان کی رہنمائی میں شعروادب میں نئے نئے تجربات کرنے لگے۔ اس سے نہ صرف حلقے میں ایک نئی روح پیدا ہوئی بلکہ اس کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا، کثرت سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور یوں اس کا دائرہ اثر بڑھتا گیا۔

حلقہ ارباب ذوق کے تجربات زندگی اور فن دونوں سے باہم مربوط تھے۔ اس کے تصور ادب میں فن کو دوام حاصل ہے، لیکن یہ دوام بہرطور زندگی سے ہی مستعار ہے۔ میراجی کا خیال تھا کہ ''اصلاً ادب میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا... اور انداز نظر کا تغیر محض لغوی ہے نظری نہیں... کیونکہ فن زندگی چھوڑ جس سے جی چاہے لپٹ جائے، بہرصورت فن ہی رہے گا۔'' (بہترین نظمیں، 1941، ص، 17)

حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں نے کئی طرح کے تجربات کیے جن میں سے بعض تجربات کامیاب ہوئے اور ان کی تقلید کی گئی۔ کچھ تجربات ایسے بھی تھے جو عارضی ثابت ہوئے اور دور تک یا دیر تک نہ چل سکے۔ مثلاً نظم کے حوالے سے میراجی نے ایک تجربہ یہ کیا کہ پوری نظم میں حروف جار اور افعال کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا۔ اس پر قیوم نظر نے سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ایسی نظموں میں رس بالکل نہیں ہوتا، پھر یہ کہ پیکر تو بنتا ہے لیکن وہ متحرک نہیں ہوتا۔ ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ ایک ہی تاثر کو مختلف شعراء نے اپنے اپنے طور پر نظم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس تجربے میں تخلیقی عمل کے دوران پیدا ہونے والی شعری کیفیت کے بجائے آورد یا صنعت گری کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تجربات اپنی مشکل پسندی اور جذباتی شدت کی کمی کے باعث خاطر خواہ رواج نہ پا سکے اور جلد ہی فنا ہو گئے۔

حلقہ ارباب ذوق کے جن تجربات کی پذیرائی ہوئی، انھیں مقبولیت ملی اور جن کی وجہ سے حلقے کے شاعروں اور ادیبوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی وہ ہیں علامت نگاری، وجودیت اور سرئیلزم وغیرہ۔ جن سے حلقے والوں نے اردو ادب کو نہ صرف روشناس کرایا بلکہ بہت سی ایسی تخلیقیں بھی پیش کیں جو اردو شعروادب کا جز بھی بنیں اور انھیں پُرثروت بھی بنایا۔ ساتھ ہی نفسیات کے نئے دریافت شدہ علم سے بھی انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ظاہر ہے یہ مغربی فن وادب کی تحریکیں تھیں جن سے حلقے کے ادیبوں نے اثرات قبول کیے اور ان کے استعمال سے اردو شعروادب میں تنوع، توانائی اور جدت پیدا کی۔ نئی نظم کی تحریک کو پروان چڑھانے میں بطور خاص اہم رول ادا کیا، لفظ اور خیال کو علامتی انداز میں پیش کر کے مفاہیم میں گہرائی پیدا کی، معنی کی متعین حدود کو وسعت بخشی اور روایتی انجماد سے انحراف کیا۔ اس حوالے سے حلقے کے ادیبوں نے سائنسی تعقل پسندی کو عام کیا اور انسان کے داخل میں آباد کائنات کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے نہ تو کسی تجربے پر بندش عائد کی اور نہ کسی موضوع پر پابندی لگائی۔ یوں حلقہ ارباب ذوق میں زندگی کے تنوع اور فن کے ذریعے اس کے داخلی حسن کی نقاشی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

حلقہ ارباب ذوق کے تصورات ونظریات اور اس میں پیش کی گئی تخلیقات کی شہرت کا سب سے اہم وسیلہ اس کی ہفتہ وار مجلسوں کی وہ انوکھی نوعیت کی فی البدیہہ تنقید بنی جو مجلس کے شرکاء کسی بھی فن پارے پر کرتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ سامعین مجلس میں پڑھی جانے والی تحریر پر بحث کرتے، اس کے تمام پہلوؤں کو اپنے نظریے کی روشنی میں پرکھتے اور اس کے محاسن معایب کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ جب کہ مصنف کو اس بحث میں حصہ لینے اور اپنی رائے کے اظہار کی ممانعت تھی۔ ایسا اس لیے کیا گیا تھا تاکہ مصنف کی مراد یا اس کے نظریے سے قطع نظر فن پارے کی غیر جانبدارانہ تفہیم ممکن ہو سکے۔

شروع شروع میں اس نئے انداز کی تنقید کو شک اور حیرت کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس پر بدذوقی اور بدعت کا الزام لگایا گیا اور علامہ تاجور نجیب آبادی نے تو یہاں تک کہا کہ اس میں غزل پر تنقید کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن دھیرے دھیرے اس نئی طرز کی تنقید نے مقبولیت حاصل کر لی۔ اس طریقۂ تنقید کے کئی فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ نئی شاعری کو فروغ ملا، دوسرے یہ کہ علامتی نظمیں جن کا مفہوم پہلی قرات میں واضح نہیں ہو پاتا تھا اس تنقیدی اور تجزیاتی عمل سے گزرنے کے بعد ان کی معانی کی پرتیں کھلتی چلی جاتیں اور سامع اور قاری پر کثرت معانی کی ایک نئی دنیا منکشف ہو جاتی۔ اس کا تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ ناقدوں میں حق گوئی و بیباکی اور جرأت اظہار کا حوصلہ پیدا ہوا۔ چوتھا یہ کہ خود مصنف کے اندر اپنی تحریروں پر ہر قسم کی تنقید

برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہوا، اور مختلف رایوں کے سامنے آنے کے بعد انھیں اپنی تحریر اور فکر وخیال میں تبدیلی اور وسعت لانے کے مواقع حاصل ہوئے۔

ان تجربات اور نئے مباحث سے تنقید کے جدید اصولوں کی توضیح واشاعت تو ہوئی ہی، ایک نئے شعور نے بھی جنم لیا۔ اس نئے شعور کے اثرات تخلیقات میں جلوہ گر ہونے لگے جس کی وجہ سے نئی شاعری مزید ترقی کے منازل طے کرتی گئی، اور افسانے کی صنف میں بھی واضح تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔

موضوعات:

حلقہ ارباب ذوق نے گو کہ شعروادب کا بنیادی سرچشمہ زندگی کو ہی قرار دیا تھا لیکن ترقی پسند تحریک کے برعکس اس نے زندگی، سماج اور معاشرت کے مسائل کو براہ راست شعروادب کا موضوع بنانے سے گریز کیا اور تخلیق کو یک رخے پن سے بچانے کے لیے علامت یا ایک نوع کے ابہام کا سہارا لیا۔ اسی زمانے میں 'ادب برائے زندگی' اور 'ادب برائے ادب' کی زوردار بحث شروع ہوئی۔ اس ضمن میں 'ادب اور پروپیگنڈہ'، ادب اور صحافت، ادب اور جمالیات، یا پھر 'شاعری میں ابہام کا مسئلہ، جذبہ اور خیال کی اہمیت اور جدید شاعری اور نفسیات وغیرہ جیسے موضوعات کے ذریعے نظریاتی موقف کو ثابت کرنے اور ایک نئے شعور کو جنم دینے کے لیے یہ مباحث شدت سے اٹھائے گئے۔ یہ طریقہ کار بھلے ہی اوروں کو راس آیا ہو لیکن ترقی پسندوں کو بالکل بھی اچھا نہ لگا۔ کہ یہ نہ صرف ان کے نظریے کو زک پہنچاتا تھا بلکہ حلقہ ارباب ذوق ان کے حریف کے طور پر مقبولیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ چنانچہ علی سردار جعفری اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں انتہائی سخت لہجہ اپناتے ہوئے حلقے کی مخالفت اس طرح کرتے ہیں:

> ''اسی زمانے میں ایک گروہ نے سر اٹھایا۔ یہ ہیئت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے، جن کے مشہور نمائندے میراجی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ تھے۔...ان کی رومانیت مجہول اور گندی تھی...ان کا انا کسی قسم کی سماجی ذمے داری کو برداشت نہیں کرتا تھا جس کا لازمی نتیجہ ابہام، قنوطیت اور فرار تھا۔'' (ترقی پسند ادب، ص، 160)

حلقے کا یہ نظریہ تھا کہ ادب قائم بالذات ہے اور یہ آپ ہی اپنی منتہا ہے۔ ادب کی اپنی جمالیاتی اقدار ہیں جن کی پابندی کر کے شاعر وادیب زندگی کے حسن کو ابھارتا ہے۔ یہ کسی خاص نصب العین یا مقصد کے حصول کے لیے تبلیغی فریضہ انجام نہیں دیتا۔ حلقے والوں نے زندگی کی ان تمام قدروں کو سراہا اور انھیں اپنی تخلیقات میں برتا جن کی صداقت دوامی ہیں، یا جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سماج یا معاشرے کی تبدیلی انھیں متاثر نہیں کرتیں، چنانچہ جذبہ، احساس اور خیال کی ترجمانی کو اساسی اہمیت دی گئی اور باطن کی پیش کش کے لیے فن کے لوازم کو اہم قرار دیا گیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حلقے نے کسی موضوع پر کوئی پابندی لگانے کے بجائے ادیب کی تخلیقی آزادی کو ترجیح دی اور انھیں موضوعات کے انتخاب کی مکمل چھوٹ بھی دی تا کہ وہ زندگی کا مجموعی طور پر مطالعہ ومشاہدہ کر سکے اور انسان کے نفسیاتی، سیاسی، جنسی اور معاشرتی حقائق کو بالواسطہ طور پر شعروادب میں پیش کر سکے۔ حلقے کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات کو تخلیق کا بالواسطہ بنیادی حوالہ بنایا ہے اور خارج کے بیان پر باطن کے انکشاف کو فوقیت دی ہے۔

طرز اظہار:

فنی سطح پر حلقہ ارباب ذوق نے بلند بانگ لہجے کے بجائے لطیف، لوچدار اور دھیمے اسلوب کو پروان چڑھایا اور فنی سطح پر اس رجحان نے تخلیق میں ہنگامی تاثر کو بروئے کار لانے کے بجائے ایک ٹھہراؤ کی کیفیت اور دوامی حسن کی نقش گری پر توجہ صرف کی۔ حلقے نے شعروادب کو منفعت اور تبلیغ کا وسیلہ بنانے کو غیر ادبی رویہ قرار دیا اور معاشرتی سطح پر حلقے کے شاعر وادیب نے تعلّی کے بجائے اپنے اندر انکسار کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شعروادب کے ساتھ پیشہ ورانہ رویہ اختیار نہیں کیا جا سکا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ شاعر وادیب نے خارجی جبر اور ہنگامی حالات کے تحت ادب تخلیق کرنے

کے بجائے خود آگہی اور عرفان ذات کے اس لمحے سے گزرنے کا انتظار کیا جب واقعہ یا خیال جذبے کی آنچ پر پک کر تخلیق میں ایک الہامی کیفیت پیدا کرنے کے لائق نہ بن جائے۔

حلقہ ارباب ذوق کو میراجی نے اپنے ایثار، استغنا اور والہانہ جذبے سے حد درجے متاثر کیا تھا۔ نتیجتاً اس کے ارکان نے بھی ان اقدار کو فروغ دینے کے لیے شعر و ادب تخلیق کیے۔ سو، حلقے کے ادیب و شعراء کا؛ ایک نوع کی روحانیت یا یوں کہیے کہ مادی بے نیازی کا پہلو کافی روشن ہے۔ ویسے بھی یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ حلقے کے بیشتر ارکان دنیاوی راحتوں، مادی آسائشوں اور طلب جاہ و شہرت کی طرف بہت کم مائل ہوئے۔ حلقے کے بیشتر شاعر و ادیب کا رخ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر روحانیت کی جانب ضرور ہو گیا۔ اس حوالے سے میراجی، مختار صدیقی، ممتاز مفتی، یوسف ظفر، مولانا صلاح الدین احمد اور محمد حسن عسکری کے نام بلا خوف تردید لیے جا سکتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے مختلف ادوار:

ڈاکٹر انور سدید نے حلقہ ارباب ذوق کو اس کی تشکیل، اس کے فکر و عمل، اتار چڑھاؤ اور دوسری نوع کی تبدیلیوں کے اعتبار سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

1. پہلا دور: آغاز سے میراجی کی شمولیت تک۔ یعنی حلقے کی پہلی مجلس اپریل 1939 سے اگست 1940 تک۔
2. دوسرا دور: حلقے میں میراجی کی شمولیت سے لے کر اردو شاعری کی تنقید کے اجرا تک۔ یعنی اگست 1940 سے لے کر دسمبر 1940 تک۔
3. تیسرا دور: دسمبر 1940 سے لے کر قیام پاکستان یعنی 1947 تک۔
4. چوتھا دور: قیام پاکستان یعنی 1947 سے لے کر مارچ 1972 میں حلقہ ارباب ذوق کی تقسیم تک۔
5. پانچواں دور: مارچ 1972 سے لے کر 1975 تک۔

1.1 ظاہر ہے حلقے کے پہلے دور کی حیثیت تعارفی دور کی ہے۔ (اس حوالے سے مضمون کا تعارفی حصہ پڑھ لینا چاہیے۔)

2.1 حلقۂ ارباب ذوق کا دوسرا دور۔ یہ دور میراجی کی شمولیت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ میراجی نے حلقے کی تشکیل نو کرنے اور اسے بنانے اور سنوارنے میں بنیادی کردار نبھایا۔ یہ دور اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس دور میں حلقے نے ایک طرف نئے نئے تجربات کیے اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور دوسری طرف ترقی پسندی کی مقصدیت کے خلاف ردعمل کا اظہار بھی شروع کر دیا۔ شعر و ادب میں کی ترقی پسندوں کی یکسانیت پر تنوع پسندی کو ترجیح دی۔ اور خارجی بیان کے مقابلے میں انسان کے اندرون کو بیان کرنے کی کوشش کی۔

کہنا چاہیے کہ یہاں سے حلقے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور ادب کی صورت حال کو بدلنے اور ظاہر پر توجہ صرف کرنے کے بجائے فن کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کا عزم کر لیا۔ یوں حلقے نے شعر و ادب کی روایتی حیثیت کو ختم کر کے اجتہاد اور جدیدیت کی طرف تیزی سے قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ اس دور میں میراجی ساتھ ان کے دو اور دوست اور ادبی اجتہاد میں ان کے معاون یوسف ظفر اور قیوم نظر نے بھی قابل ذکر خدمات انجام دیں۔

حلقہ ارباب ذوق کو یوسف ظفر کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے جلسے کے اختتام پر ان میں پڑھی جانے والی نظموں اور غزلوں پر دی جانے والی روایتی داد و تحسین کے تفریحی پہلو کو ختم کیا، اور مضامین اور مقالات کی طرح شاعری پر بھی سوالات قائم کرنے، بے لاگ اظہار خیال کرنے اور تنقیدی بحث کی شروعات کی۔

قیوم نظر حلقۂ ارباب ذوق کے بے حد فعال اور متحرک رکن رہے۔ حلقے کی تحریک کو فنی اعتبار سے توانائی بخشنے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے حلقے کو منظم کیا، حلقے کے ارکان کی تخلیقات کو سلیقے سے پیش کرنے اور نئی نظموں کا سلسلہ جاری کرنے میں اہم رول ادا کیا اور نئی تحریروں کے ذریعے حلقے کے رجحان کو مقبول عام بنانے میں سرگرم حصہ لیا۔

3.1 تیسرا دور۔حلقۂ ارباب ذوق کا تیسرا دور تقریباً سات سال کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔اس دور میں حلقے کی شاخیں دلی، ممبئی اور کراچی میں قائم ہوئیں۔محمد حسن عسکری، تابش دہلوی، اکرام قمر، اختر الایمان اور مختار صدیقی نے حلقے کے رجحان کو ممبئی اور دہلی میں مقبول بنانے کی جد جہد کی۔

اس دور میں ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کی بحث کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور اس حوالے سے نظریاتی مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔جس میں ظاہر ہے ترقی پسندوں اور حلقۂ ارباب ذوق والوں نے اپنے اپنے موقف کی حمایت اور ایک دوسرے کے تصورات ونظریات کی مخالفت کو بحث کا مرکزی حوالہ بنا کر اپنا دفاع بھی کیا اور دوسروں پر حملے بھی کیے۔

تجربات کے حوالے سے اس دور میں مغرب کی مختلف تحریکوں اور وہاں کی اصطلاحوں اور اصناف کو اردو ادب سے روشناس کرایا گیا۔تاثریت، علامت نگاری اور وجودیت کی تحریک کے علاوہ سرئیلزم کو بھی اردو کی متعدد تخلیقات میں خوبی اور سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کوشش کے نتیجے میں ادیب کا رشتہ خارج کے مقابلے داخل سے زیادہ استوار ہوا۔یہ تجربات نظم میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے، اور مختصر سے عرصے میں یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی، منیب الرحمان، مجید امجد، ضیا جالندھری اور انج رومانی وغیرہ نے ایسی عمدہ اور جاندار تخلیقات پیش کیں جن میں زندگی کا کوئی زاویہ ان کے تخلیقی لمس سے محروم نہ رہا۔

حلقہ ارباب ذوق کے نظریات اور اس کے ادبی رجحان کو اس دور میں ایک اور چیز سے بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت ملی۔وہ تھی مختلف ارکان کے گھروں میں منعقد ہونے والی ہفتے وار مجلسیں۔جن میں شاعر، ادیب اور دوسرے قلمکار کی پیش ہوئی تحریروں پر شرکائے مجلس کی تنقیدیں کرتے تھے۔اس مجلس میں جو کوئی اپنی تحریر پیش کرتا تھا اس کے علاوہ تمام سامعین کو حق تھا کہ وہ پڑھی گئی تحریروں کی خوبیوں اور خامیوں پر کھل کر گفتگو کر سکتا ہے اور کمیوں کی نشاندہی بھی کر سکتا ہے۔

اس تنقیدی طریق کار کا اچھا پہلو یہ تھا کہ ناقد کے اندر جرأت، بے باکی اور دیانتداری کی خو پیدا ہوتی تھی اور مصنف کو اپنی تحریروں پر بے لاگ تنقید برداشت کرنے حوصلہ ملتا تھا۔لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ چونکہ مصنف کو اس بحث میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی اس لیے وہ بہت سے اعتراضات کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ بعض اوقات ناقد اصل موضوع سے بھٹک کر اپنی علمیت کا اظہار کرنے لگ جاتے تھے۔کسی حد تک اس تنقیدی طریق کار نے خود نمائی کے جذبے کو بھی فروغ دیا۔اس کے باوجود اس مجلسی تنقید کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے حلقے کے نظریات کو مقبول عام بنایا، انھیں استحکام عطا کیا اور فکر ونظر کے متعدد گوشوں کو منور کیا۔

اس دور میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ حلقے نے سال بھر کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا۔یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو تین سال بعد ہی اس کے خلاف نہ صرف ردعمل رونما ہونے شروع ہو گئے، بلکہ بعض دوسرے اداروں نے بھی اسی طرح کے مجموعے شائع کرنا شروع کر دیے۔لیکن حلقے کے منتخب مجموعے میراجی کے تنقیدی جائزوں کی بنا پر دوسرے تمام مجموعوں سے ممتاز اور منفرد ہوتے۔

حلقے سے شائع ہونے والے نظموں کے انتخاب میں حتی الامکان غیر جانبداری برتی جاتی تھی۔ان مجموعوں میں بالعموم ترقی پسند شعراء کی وہ نظمیں بھی شامل کر لی جاتی تھیں جو خیال اور اسلوب کی کسی رعنائی کی مظہر ہوتیں۔لیکن حلقہ ارباب ذوق کی اس بے تعصبی اور غیر جانبداری کو ترقی پسندوں نے شک کی نظروں سے دیکھا اور علی سردار جعفری نے اس پر یہ الزام لگایا کہ ''نئے ادب کے نام پر انفعالیت اور انحطاطیت کے جس رجحان کو حلقہ ارباب ذوق کو فروغ دے رہا تھا، اس میں دانستہ طور پر ترقی پسند ادیبوں کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔''

حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے سال بھر کی بہترین نظموں کو شائع کرنے یہ سلسلہ بے حد مفید تھا اور عوام میں بے حد مقبول بھی تھا۔لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے یہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا اور چند برسوں بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس دور میں حلقے نے ایک منظّم، مضبوط اور فعال تحریک کا روپ اختیار کیا۔نئی نظم کی تحریک کو توانائی ملی، علامت نگاری پر اصرار بڑھا اور ادب کو

ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی گئی۔اس دور میں حلقے کے بنیادی تصورات ونظریات پوری طرح نکھر کر سامنے آئے۔ چنانچہ اس دور میں حلقے کے خلاف شدید ردعمل کی لہر اٹھی اور اپنے عہد کی سب سے مضبوط تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کی مخالفتوں کا اسے سامنا کرنا پڑا۔کہنا چاہیے کہ یہ دور حلقۂ ارباب ذوق کے تجربات کا دور تھا،اس کی نظریاتی پختگی کا بھی دور تھا،اس کی مقبولیت کا دور تھا،اور اپنے عہد کی دوسری تحریکوں سے اس کے سخت مقابلے کا بھی دور تھا۔

4.1 چوتھا دور: حلقے کا چوتھا دور تقسیم ہند یا قیام پاکستان، یعنی 1947 سے لے کر 1972 تک کے طویل عرصے کو محیط ہے۔تیسرے دور کے مقابلے میں یہ دور کافی پُرسکون تھا۔اس دور میں اختلافات اور مقابلہ آرائی کے مواقع بہت کم پیش آئے۔ چنانچہ یہ عرصہ حلقے والوں کے لیے شعروادب کی تخلیق کا معتدل دور ثابت ہوا۔

یہ درست ہے کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات،فسادزدوں کی نقل آبادی، بے روزگاری اور صدیوں کے گنگا جمنی رشتے اور اعتماد ٹوٹنے کا کرب جیسے متعدد مسائل تھے جن پر ترقی پسند تحریک اپنے شعروادب میں واضح ردعمل بھی ظاہر کر رہی تھی۔

ترقی پسندوں ادیب فسادات اور اس سے پیدا ہونے والی نفرت کو اپنے ادب سے روکنے یا کم کرنے کا کام لے رہے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر اسی عرصے میں ترقی پسند تحریک کا اچھا خاصا لٹریچر وجود میں آچکا تھا۔جب کہ حلقہ ارباب ذوق ترقی پسند تحریک کی طرح براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تخلیقی عمل کا قائل ہے،اس لیے حلقے کے شعروادب میں تقسیم کے فسادات اور اس کے مسائل پر فوری ردعمل کم ملتے ہیں۔ حلقے کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہنگامی واقعات یا حادثات کو تخلیق کے قالب ڈھالنے کے لیے زمانی بعد ضروری ہے۔ چنانچہ حلقے کے مصنفوں نے اس کرب کو تخلیق کے آنسو میں ڈھلنے اور حقائق کے سامنے آنے کا انتظار کیا،تاکہ تحریروں میں اعتدال،توازن اور دیانتداری کے عنصر کے ساتھ تخلیق کی شان پیدا ہو سکے۔

1948 حلقے کے جن مضامین نے اپنی طرف توجہ مبذول کروائی ان میں ''اردو پر تقسیم ملک کا اثر'' (مولانا صلاح الدین احمد)،''پاکستان میں اردو اور حلقہ ارباب ذوق'' (یوسف ظفر)،''فرقہ وارانہ جنگ میں ادیب کے فرائض'' (کچھ تو کہیے) اور ''ہنگامی نظم کا ادب میں درجہ'' (کچھ تو کہیے) کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حلقے والے مسائل سے غافل نہیں تھے، بلکہ انھیں سمجھنے کے ایک مسلسل عمل سے گزر رہے تھے۔

اس دور میں حلقے کا ایک اہم کارنامہ لاہور سے ایک ادبی رسالے ''نئی تحریریں'' کا اجرا ہے۔ یہ رسالہ روایتی نہج پر نہیں بلکہ ایک تجربے کے طور پر جاری ہوا۔ایک تو یہ کہ اس میں تخلیق کاروں کو شہرت دینے کے بجائے تخلیقات کو مقبول بنانے کی کوشش کی گئی۔اس لیے اس رسالے میں ایک فنکار کی ایک یا دو چیزیں شامل کرنے کے بجائے بیک وقت اس کی بہت سی تخلیقات پیش کی گئیں۔ اس سے قاری کو فن کی پہچان اور فنکار کی انفرادیت کی شناخت میں کافی مدد ملی۔ دوسرے یہ کہ اس رسالے کو کتابچے کا وقار حاصل ہوا۔

چونکہ حلقے کی مجلسوں کی طرح اس کا رسالہ ''نئی تحریریں'' بھی آزادیٔ اظہار ایک فورم تھا،اس لیے اس میں دوسری زبانوں کے اہم نظریاتی مضامین نمایاں طور پر شائع کیے جاتے تھے۔ایلیٹ کا مضمون ''شاعری کی تین آوازیں'' (ترجمہ،ن۔م۔راشد)، پال ویری کا مضمون ''شاعری اور فکر مجرد'' (ترجمہ،محمد حسن عسکری)، سینٹ بیو کا مضمون ''کلاسیک کیا ہے'' (ترجمہ،غلام یعقوب انور)، لائنل ٹرلنگ کا مضمون ''ادب اور فرائڈ'' (ترجمہ،سید امجد الطاف)، اور زینو سیورینی کا مضمون ''مارکسیت اور فن'' (ترجمہ،سجاد رضوی) بطور خاص اہم اور قبل ذکر ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حلقہ ارباب ذوق کے توسط سے ان ترجم کے ذریعے اردو ادب نے بعض ایسے مغربی سرچشموں سے فیض حاصل کیا جن تک پہلے اردو ادب کی پوری طرح رسائی نہیں تھی۔

اس دور میں ترقی پسند تحریک نہ صرف بکھرنے لگی تھی، بلکہ اس کا حلقہ سمٹتا جا رہا تھا اور اس کی مقبولیت میں دن بہ دن کمی آرہی تھی۔ یوں حلقہ ارباب ذوق اکیلی تحریک تھی جو ادبی سرگرمی اور مقبولیت کے عروج پر تھی،اور برصغیر کے طول وعرض میں اس کی کا حلقہ لگاتار وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ آزادی کے بعد حلقہ ارباب ذوق میں بیک وقت کئی نسلوں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔مثلاً شیر محمد اختر کے سامنے ہی انتظار حسین کی نئی نسل نے انفرادیت کا علم بلند کیا،اور ناصر کاظمی کے رخصت ہونے سے پہلے انور سجاد میدان عمل میں آگئے۔اور ان کی موجودگی میں ہی شاہد محمود ندیم اور سراج منیر وغیرہ کی آوازیں حلقے میں گونجنے لگیں۔ یوں عمر،علم اور تجربے کے فرق نے حلقے میں ایک انتشار کی کیفیت پیدا کر دی۔کئی معمر

ادیبوں کو شکایت ہوئی کہ بعض نوجوان ادیب ان کے جائز احترام کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ پھر جن ادیبوں کے خلاف تادیبی کاروائی ہوتی وہ حلقے کی سرگرمیوں میں کم حصہ لیتے۔ اس طرح حلقے کی داخلی کمزوریوں کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ حلقہ ارباب ذوق کے روح رواں اور پیر مغاں میراجی کی وفات ہے۔ میراجی کے انتقال نے حلقے کو شدید طور پر متاثر کیا۔ حلقہ اپنے اس مرکزی اور فعال شخصیت سے محروم ہوگیا جس کے فکری محور پر یہ تحریک گردش کر رہی تھی۔ چنانچہ حلقے روایت کمزور پڑنے لگی، ہفتہ وار مجلسوں کی تنقید کا رخ موضوع سے ہٹ کر ذاتیات کی طرف مڑنے لگا تھا، انتظامیہ میں عہدوں کو لے کر جھگڑے سر اٹھانے لگے تھے اور تادیبی کاروائیوں، ممبروں کی نگرانی اور ان کے اخراج کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ انتشار کا یہ عمل گو کہ انتہائی سست رفتار تھا، لیکن سچائی یہ ہے کہ چوتھے دور کو یہ سب کچھ دیکھنا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ حلقے کی بقا کا راز اس کی وسیع القلبی تھا۔ چنانچہ حلقے نے ترقی پسند ادیبوں کے داخلے یا مخالفانہ نقطہ نظر کی پیش کش پر کبھی پابندی نہیں لگائی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اس دور کی مجلسوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی شرکت سے حلقے کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آنا شروع گئی تھی اور ادب میں افادیت کے سوال پر بحث کا رخ ترقی پسند نظریات کی جھکانے کی کوشش شروع ہوگئی تھی۔ ان ادیبوں نے صرف حلقے کے مزاج کو بدلنے کی ہی کوشش نیں کی بلکہ بقول انور سدید ''حلقے پر شب خون مار کر اس پر قبضہ کرنے کی سعی بھی کی۔ اور اس کاوش میں ان نجوانوں سے زیادہ معاونت حاصل کی جو ہر اٹھتی ہوئی لہر کے ساتھ چلنے اور فوری شہرت کے آرزومند تھے۔'' (اردو کی ادبی تحریکیں، ص 578)

اور بالآخر وہی ہوا جو انتشار و اختلاف کے نتیجے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یوسف ظفر کے انتقال کے فوراً بعد ہی حلقہ ارباب ذوق دو حصوں میں بٹ گیا۔ حلقے پر قابض انقلابی گروہ کو ''حلقہ ارباب ذوق سیاسی'' نام تفویض ہوا، اور دوسرا ''حلقہ ارباب ذوق ادبی'' کہلایا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں گروہ نے اپنا آئیڈیل میراجی کو ہی قرار دیا۔

5.1 پانچواں دور: پانچواں دور 1972 سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہی وہ سال ہے جب حلقہ ارباب ذوق دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ یعنی ''حلقہ ارباب ذوق سیاسی'' اور ''حلقہ ارباب ذوق ادبی''۔

حلقہ ارباب ذوق (سیاسی):

اس حلقے نے ابتدائی تین برسوں میں حلقہ ارباب ذوق کی قدیم روایات کو توڑنے اور اس کی نئی تشکیل کی کوشش کی۔ تبدیلی کے اس عمل کو عزیز الحق نے تیز کرنے میں انقلابی کردار ادا کیا۔ انھوں نے ادب اور زندگی کو پرولتاریہ نقطہ نظر سے پرکھا، اور ادب کی تخلیق کو مادی رشتوں کا مرہون منت اور پیداواری ذرائع کے فروغ کا وسیلہ قرار دیا۔ ظاہر ہے ان کا نقطہ نظر مارکسی نظریات سے ماخوذ تھا۔ چنانچہ اس حلقے میں ترقی پسندی کو فروغ دینے پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔

اس حلقے نے قومی اور بین الاقوامی موضوعات کو ترجیح دی۔ ''مباحثوں میں چونکہ سیاست مرکزی موضوع ہوتا تھا، سو اکثر اوقات تنقید ہنگامے کی شکل اختیار کر جاتی اور بسا اوقات نوبت گالم گلوچ اور ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی۔'' (نوائے وقت 13 نومبر 1973) چنانچہ چنانچہ اس عہد میں حلقے میں جو تخلیقات پیش کی گئیں ان پر مطلق العنانی، انا پرستی اور غصے کا لہجہ غالب تھا۔ اور وہ لچک جو بقول میراجی نت نئے رنگوں میں ڈھل جاتی ہے نظر نہیں آتی تھی۔ '' (نئی تحریریں، شمارہ اول، ص، 6)

سیاسی حلقہ ارباب ذوق کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بن لکھے دستور پر عمل کی روایت ختم کر دی اور حلقے کے لیے پہلی بار ایک تحریری آئین منظور کروایا۔ اس آئین کے مطابق نئے اغراض و مقاصد یہ تھے:

1 اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت۔

2 نئے لکھنے والوں کی تعلیم وتہذیب۔

3 اردو زان وادب کو علاقائی زبانوں اور ثقافتوں کے قریب لانا۔

4 لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت۔

5 ادب اور تنقید ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا۔

ظاہر ہے یہ آئین حلقے کی پرانی روایت سے کافی مختلف ہے۔اس آئین میں ادب کو زندگی کے زیرنگیں کرنے کی واضح کوشش نظر آتی ہے۔اس آئین کے بعد ہنگامی واقعات پر فوری ردعمل ظاہر کرنے کی ترقی پسند روش کو فروغ حاصل ہوا۔

اس حلقے کا ایک کارنامہ بڑے بڑے سیمیناروں کا انعقاد بھی تھا۔ چنانچہ سیمینار اس کروفر سے کیے جاتے جن پر بین الاقوامی میلے کا گمان ہوتا تھا۔اس کے علاوہ قدیم روایت کو توڑ کر حلقے نے بیرونی امداد بھی حاصل کرنے شروع کر دیے تھے۔سو کہنا چاہیے کہ ان چیزوں سے حلقہ ارباب ذوق کی درویشی کی جگہ دنیاداری آ گئی جس سے حلقے کی ساکھ کو کافی نقصان پہنچا۔

حلقہ ارباب ذوق (ادبی)

اس حلقے نے پرانی روایات کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔اس میں بھی شک نہیں کہ ادبی حلقے کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے۔اور اس میں ادب کا ایک معیار قائم رکھنے کی بھی کوشش کی گئی،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پرانے طریقوں کو نباہنے کے باوجود اسے پہلے جیسا استحکام حاصل نہ ہو سکا۔

اس کی ایک وجہ تو حلقے کا غیر فطری تقسیم تھا۔دوسری وجہ یہ کہ بالعموم ایک حلقے کے ادیب دوسرے حلقے میں شرکت کرتے۔ایک ادیب صبح ایک حلقے میں غزل پڑھتا تو اسی شام دوسرے حلقے میں نظم سنانے آتا،ایک حلقے میں افسانے سناتا دوسرے میں مضمون پڑھ آتا۔اسی طرح بڑے ادیب بلا تخصیص دونوں حلقوں کی صدارت قبول کر لیتے۔ان باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ کس شاعر یا ادیب کی وفاداری کس حلقے کے ساتھ ہے۔ تیسری اور اہم وجہ یہ رہی کہ نظریاتی اختلافات کے باوجود دونوں حلقے ایک دوسرے کے حریف نہیں پائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے بڑھنے اور تخلیقی برتری حاصل کرنے کا جذبہ ماند پڑ گیا۔اور نیا نکتہ پیدا کرنے یا نئی روات قائم کرنے کے رجحان کو فروغ نہ مل سکا۔

حلقہ ارباب ذوق کی شاعری:

حلقہ ارباب ذوق کی شاعری میں بنیادی اہمیت اس حسیت کو حاصل ہے کہ شاعر خارج اور باطن کی دو دنیاؤں میں آہنگ اور توازن کس فنکارانہ طریقے سے پیدا کرتا ہے۔حلقہ ارباب ذوق نے متخیلہ کو بیدار کر کے جذبہ خیال اور احساس کے ایک سلسلہ بے کراں میں ہم آہنگی پیدا کی اور اس تخلیقی کاوش کے لیے لفظ کے لغوی معنی کو توڑ کر اس تصوراتی اور تخلیقی معنی کو اجاگر کیا۔ چنانچہ حلقہ ارباب ذوق کی شاعری درحقیقت دھندلے اجالے سے حسن،نغمہ اور سحر پیدا کرنے کی شاعری ہے اور یہی اس کی منفرد خصوصیت ہے۔

حلقہ ارباب ذوق نے غزل کو گیت کے آہنگ سے قریب تر کر دیا،اور عربی فارسی کے بوجھل اسلوب اور اضافتوں کو ترک کر کے ایک ایسی زبان اور ایسا اسلوب خلق کیا جو آسان اور ہموار تھا،اور جو جذبے کی داخلی کیفیت کو اصلی رنگوں میں پیش کرنے پر قادر تھے۔ایک دوسری صورت یہ تھی کہ حلقے کے زیادہ تر شاعروں نے بالعموم چھوٹی بحروں کو استعمال کیا اور غزل میں سہل متنع کی کیفیت پیدا کی۔آزادی سے پہلے اس طرز کو اپنانے والوں میں میراجی، یوسف ظفر،قیوم نظر اور انجم رومانی وغیرہ تھے۔اور آزادی کے بعد ناصر کاظمی،شہزاد احمد اور شہرت بخاری وغیرہ۔

حلقہ ارباب ذوق کے سب سے اہم شاعر میراجی ہیں۔میراجی کی شاعری جس زمانے میں مشہور ہوئی،اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کے

اثر سے مقصدی شاعری عروج پر تھی۔لیکن میراجی نے ترقی پسند تحریک کی واضح مقصدیت کو قبول کرنے کے بجائے جذبات واحساسات کے ان دھندلکوں کو اپنایا جن میں سب کچھ واضح اور روشن نہیں ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے شاعری میں سپاٹ تصویریں نقش کرنے کے بجائے ان لکیروں اور نقطوں کو بھی جمع کیا جن کے پیچھے سے روشنی چھن کر آتی تو رنگوں کی جیسے دھنک کھل اٹھتی۔

میراجی نے اپنی شاعری میں باتوں کو وسعت دینے کے بجائے انھیں استعارہ، علامت اور تمثال کے مختصر سے جامے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔اور معنی کو متن کی سطح پر سجانے کے بجائے پیچ کی مانند کئی تہوں میں پوشیدہ رکھ کر پیش کیا۔ میراجی نے ماضی قدیم کو پروہت کی آنکھوں سے دیکھا اور ایک مخلص عبادت گزار کی طرح اسے زندہ کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف ہندوستانی تہذیب کا ارضی پہلو پیدا کیا بلکہ جنس کے منہ زور جذبے کو بھی انھوں نے موضوع بنایا، اور اسے زندگی کی ایک زندہ علامت اور فعال قوت کے طور پر استعمال کیا میراجی کی شاعری قاری کو گیلی لکڑی کی طرح سلگاتی اور اس کے باطن میں آنچ سی پیدا کر دیتی ہے۔

میراجی کی شاعری کا دوسرا زاویہ گیت ہے۔میراجی کے گیت لفظوں اور آوازوں کی ایک سرمالا ہے جو راگ کی ڈوری سے بندھی ہوئی ہے، جسے میراجی نے اس لہر سے پیدا کیا ہے جو جیرانے کے مختصر سے لمحے سے پیدا ہوتی ہے۔ میراجی نے اپنے گیتوں کے ذریعے سے قاری کو روحانی فلسفے سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے جس کی ترویج قدیم زمانے میں میرابائی، امارو اور چنڈی داس نے کی تھی۔ چنانچہ ''جیون آس کا دھوکا گیانی''۔''دامن کھائے جھکولے''۔''نچل کی بات نہ ہم سے کہو، دل دامن کا متوالا ہے۔'' جیسے گیتوں میں مشرق کا روحانی مزاج اور فلسفہ پوری طرح الفاظ کے آئنے میں ڈھل گیا ہے۔

میراجی کی شاعری کا تیسرا زاویہ غزل ہے۔میراجی نے غزل کو کنواری عورت کہا ہے۔لہٰذا انھوں نے اس عورت سے ہمیشہ لطیف کلامی اور ملائمت سے گفتگو کی، اور اس میں ایسی کیفیت پیدا کی جو گیت کی استھائی میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

وہ درد جو لمحہ بھر رکا تھا　　مژدہ کہ بحال ہو گیا ہے

چاہت میں ہمارا جینا مرنا　　آپ اپنی مثال ہو گیا ہے

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا
لب پر ہے فریاد کہ ساقی وہ کیسا میخانہ ہے
رنگ خون دل نہیں چمکا گردش میں پیمانہ ہے

قیوم نظر کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے ہر لمحہ رنگ بدلتی دنیا کو اپنا موضوع بنایا۔اور ان کیفیتوں کو شعری پیکر کے قالب میں ڈھالا جو کبھی نغمہ وروشنی بن کر فضاؤں کو مترنم اور منور کر دیتی ہیں اور کبھی کسک کی صورت اختیار کر کے فضا کو غموں سے بھر دیتی ہے۔قیوم نظر دراصل حیرت اور استعجاب کے شاعر ہیں۔ان کی حیرت زدگی میں ایک نوع کی دل گرفتگی اور ان کے استعجاب میں ایک طرح کی معصومیت ہے۔ چنانچہ وہ قاری کی روح کو ٹٹولتے اور چپکے سے اس کے دل میں اتر کر اسے فطرت کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے اور اس کے کیف وکم سے سرشار ہونے کی بات کہتے ہیں۔

ایک شفاف ٹکڑا بادل کا　　یا کوئی پرزہ نوری آنچل کا
دور افق کے قریب لہرایا　　آرزوؤں نے دام پھیلایا
میں نے چاہا کہ اپنی بات کہوں　　ہو سکے گر تو اس کے ساتھ چلوں
میری رفتار برق وار نہ تھی　　اور اسے تاب انتظار نہ تھی

قیوم نظر نے بھی میراجی کی طرح تینوں اصناف یعنی نظم، غزل اور گیت میں یکساں قوت کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے علامتوں اور استعاروں کو کسی خاص نظام کے تابع نہیں رکھا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں یکسانیت کی بے کیفی پیدا نہیں ہوتی۔

حلقہ ارباب ذوق کی شاعری میں یوسف ظفر کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے زندگی سے خام مواد حاصل کر کے اسے داخل کی ہلکی آنچ پر پکایا اور تب اسے شاعری کے قالب میں ڈھالا۔ چنانچہ وہ صرف خارج کو ہی متحرک نہیں کرتے بلکہ داخل کی سوزش بھی قاری کے دل میں بڑی خوبی سے اتار دیتے ہیں۔ یوسف ظفر نے کہیں لکھا ہے کہ ''انگریزوں کے زمانے میں غلامی کا احساس میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ وطن کی محبت کا جذبہ ان کی شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے دور کی شاعری میں وطن کو زنداں کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے، اور آزادی کے بعد ان کی شاری میں وطن ماں کے روپ میں ابھر کر آیا ہے۔

یوسف ظفر اپنی شاعری میں الفاظ کے علامتی استعمال سے نئی معنویت اور ان کے ظاہر سے دردانگیز غنائیت پیدا کرتے ہیں۔ اس انداز کو انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں بڑے سلیقے سے نبھایا ہے۔

ان کے علاوہ حلقہ ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں ضیا جالندھری، انجم رومانی، اختر الایمان، مجید امجد، سلام مچھلی شہری، منیر نیازی، وزیر آغا، اعجاز فاروقی اور جیلانی کامران بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بعد کے اہم شعرا میں بشر نواز، شکیب جلالی، شہاب جعفری، محمود ایاز، عزیز تمنائی، قاضی سلیم، ساقی فاروقی، عرش صدیقی، کمار پاشی، محمد علوی، عمیق حنفی اور شاذ تمکنت وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ غزل کو جن شاعروں نے اسلوب حیات کے طور پر قبول کر کے اس میں انفرادیت پیدا کی ان میں اہم نام ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور شہرت بخاری کے ہیں۔

افسانہ: حلقہ ارباب ذوق کی تخلیقی جہت نے شاعری کی طرح اردو افسانے کو بھی متاثر کیا، اور زیادہ تر ان جذبوں کی نشاندہی کی جو اپنے اظہار کی راہ نہیں پاتے۔ اس حوالے سے حلقے کے افسانہ نگاروں نے علم نفسیات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کہانی بیان کرنے کے بنیادی فریضے کو بروئے کار لاتے ہوئے بغیر پلاٹ، کردار اور فضا سے جدید افسانے کو تشکیل دیا۔ حلقے کے افسانہ نگاروں نے سماج کی ناہمواریاں اور معاشرے کی برائیوں کو اجاگر کرنے کے بجائے اُن ان دیکھے اور دبائے ہوئے جذبات کو افسانے میں شامل کیا جن سے اہتزاز خیال اور رومانی بہجت پیدا ہوتی تھی۔ اور فطرت کی بوالعجبیوں کا کوئی نہ کوئی پہلو سامنے آجاتا تھا۔ اس تحریک کے بانیوں میں شیر محمد اختر، نسیم حجازی اور رفیع پیرزادہ وغیرہ کو کہانی کے حوالے شہرت ملی۔

حلقہ ارباب ذوق کے اولین افسانہ نگاروں میں شیر محمد اختر، اوپندر ناتھ، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کا شمار ہوتا ہے۔ حلقے کے ابتدائی جلسوں میں ان لوگوں نے متعدد بار شرکت کی اور اپنے افسانے سنائے۔ لیکن بعد میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک نے ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ البتہ شیر محمد اختر نے اخیر عمر تک حلقے سے وابستگی رکھی اور افسانے لکھتے رہے۔

شیر محمد اختر کے بارے میں مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا ہے کہ ''افسانہ شیر محمد کی پہلی اور آخری محبت ہے۔'' ان کے افسانوں میں بنیادی حیثیت ان کے کرداروں کی نفسیات کے بیان کو حاصل ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی نفسیات اجاگر کرنے کے لیے ہی واقعات کے تانے بانے بنتے ہیں۔ عام انسانی رویوں اور ان کے ذہنوں کو سمجھنے میں شیر محمد اختر کی کہانیاں کافی معاون ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ننگے پاؤں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بعد میں حلقے کے آسمان افسانہ پر کئی اہم افسانہ نگار طلوع ہوئے، خاص طور سے حسن عسکری، ممتاز مفتی، آغا بابر، اشفاق احمد، غلام علی چودھری اور پھر انتظار حسین اور انور سجاد وغیرہ۔ جن کی تیز روشنی میں شیر محمد اختر کی چمک ماند پڑتی گئی۔ تاہم تاریخ ادب کے صفحات پر ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

محمد حسن عسکری اپنے افسانوں میں ان ناآسودہ خواہشوں کو مرکزی حوالہ بناتے ہیں جو معاشرے کی پابندیوں کی وجہ سے اپنا اظہار نہیں کر پاتے۔ انھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی ہے۔ چائے کی پیالی، حرامجادی اور پھسلن ان کے اہم افسانے ہیں۔ ممتاز

مفتی اپنے افسانوں میں زندگی کو نفسیات کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ان کا بیانیہ اظہار اور گریز کی ان کیفیتوں کی عکاسی ہے جو پیدا تو ذہن و دل کے کسی گوشے میں ہوتی ہیں لیکن ان کا اظہار انسانی رویے سے ہوتا ہے۔ممتاز مفتی کے اہم افسانوں میں ''آپا''، چپ، احسان علی اور جوار بھاٹا کے نام بلا تکلف لیے جا سکتے ہیں۔آغا بابر کے افسانوں کا حاوی رجحان 'جنس' ہے۔اپنے افسانوں میں اس شدید فطری جذبے کا بیان آغا بابر نے سلیقے سے کیا ہے۔'رات والے ولایت باجی' اور 'تعجب' جیسے افسانوں میں جنس کا بیان ملتا ہے۔اعجاز حسین بٹالوی اپنے افسانوں کے موضوع اور اسلوب کو باطنی جذبوں سے استوار کرتے ہیں۔اور کرداروں کے موہوم جذبے کی عکاسی بہت ہی ہلکے رنگ سے کرتے ہیں۔'کینچلی' 'گرل فرینڈ' اور 'بارہ من کی دھوبن' ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔اشفاق احمد نے گو کہ متنوع موضوعات پر افسانے لکھے ہیں لیکن محبت کی آفاقیت ان کے افسانوں کا حاوی رجحان ہے۔محبت کی مختلف جہتوں کو انھوں نے جس خوبی اور جس لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔'گڈریا'، 'امی'، شب خون اور اجلے پھول ان کے یادگار افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔غلام علی چودھری اپنے افسانوں میں کی فطری برائیوں میں نیکی کی روشنی ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔'لنگڑ العل'، 'آپا' اور بیاہ بدھ جیسے افسانوں میں انھوں نے زندگی کو نئے انداز میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔الطاف امجد نے متوسط طبقے کے نفسیاتی مسائل پر افسانے لکھے ہیں۔ 'کچے دھاگے'، 'چاک داماں تک'، اور چونے کی کلھیا اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد سعادت حسن منٹو جب لاہور چلے گئے تو انھوں حلقہ ارباب ذوق میں اپنے کئی اہم اور معروف افسانے سنائے۔ بلکہ کہا جائے کہ اس عہد میں منٹو نے ہی حلقے میں سب سے زیادہ افسانے پڑھے تو شاید غلط نہ ہوگا۔کہنا چاہیے کہ جس طرح شاعری میں میراجی نے داخلی رو کو فروغ دیا منٹو نے یہی کام افسانے میں کیا۔منٹو کے اس عہد کے افسانوں میں 'بابو گوپی ناتھ، ممی، موذیل، بادشاہت کا خاتمہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ بے حد اہم اور قابل ذکر ہیں۔رحمان مذنب نے بھی اس طور منٹو کے انداز میں ہی افسانے لکھے ہیں، کہ انھوں نے بھی طوائف اور اسی نوع کے معاشرے کو مرکز توجہ بنایا ہے۔'گوری گلاباں'، باسی گلی اور 'چڑھتا سورج' میں یہ معاشرے اپنی خارجی باطنی صفات کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہوا ہے۔الطاف فاطمہ کے افسانوں کی فضا افسردگی اور رومانیت کے ہلکے غبار سے تشکیل پاتی ہے۔لیکن اس میں رجائیت کی کرن کی تابانی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔بیر بہوٹی، دکھوں کا بیوپاری اور 'بھنور' ان کے مشہور افسانے ہیں۔

انتظار حسین حلقہ ارباب ذوق میں اپنی فنی مہارت، متنوع موضوعات اور ذہانت کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ہیئت اور بیان میں انھوں نے متعدد تجربے کامیاب تجربے کیے اور اساطیر کو جدید فنی قالب میں ڈھالا۔ماضی کی یاد اور دریافت ان کے افسانوں کا مرکزی حوالہ ہے۔کنکری، شہر افسوس، زرد پتے اور آخری آدمی وغیرہ ان کے عمدہ افسانے ہیں۔انور سجاد نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت دی، اور تکنیک اور موضوع دونوں اعتبار سے حلقے کی جدیدیت کو آگے بڑھایا۔انھوں نے انسان کی شکست وریخت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ان کے بیشتر کردار وجود کی معنویت تلاش کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔'سب سے پرانی کہانی'، ''دیوار اور دروازہ''، ''دوب ہوا اور لنجا' ان کے اہم افسانے ہیں۔ حلقے کے ان افسانہ نگاروں کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان افسانہ نگاروں کی جو حلقے کے باضابطہ ارکان تو نہیں ہیں لیکن اس کے ادبی نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس کے جلسوں میں اپنے افسانے سناتے رہے ہیں اور حلقے نے ان کی شہرت اور شناخت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان میں غلام الثقلین، جمیلہ ہاشمی، مسعود مفتی، پریم ناتھ در، رشید امجد، محمد منشا یاد، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد اور مظہر الاسلام وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حلقۂ ارباب ذوق کی تنقید: حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کی ایک جہت مجلسی تنقید ہے۔جو حلقے کے ہفتہ وار اجلاس کی دین ہے۔اس تنقید کا مقصد بھی تخلیق کے حسن و قبح کا جائزہ لینا اور اس کی جمالیاتی قدر و قیمت کا تعین کرنا تھا۔اس مجلسی یا فی البدیہہ تنقید نے ادیبوں کا ذہنی کیتھارسس بھی کیا اور انھیں جرأت اظہار بھی بخشی۔اس مجلسی تنقید نے جہاں میراجی، حسن عسکری، ریاض احمد اور وزیر آغا جیسے قد آور ناقدین پیدا کیے، وہیں بقول انور سدید ''شاد

امرتسری، عزیز الحق، عارف امان، سعادت سعید، آزاد کوثری، زاہد فارابی، خالد احمد، سراج منیر اور یوسف کامران جیسے مجلسی نقادوں کو بھی روشناس کرایا جو ہر نئے مسئلے پر خیالات کی ترتیب، فوری رائے کے اظہار اور منھ زبانی تنقید میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔''

ترقی پسند تحریک نے مقصدیت اور افادیت کو اتنی اہمیت دی تھی اور 'ادب برائے زندگی' کے اس حد تک قائل تھے کہ کسی بھی فن پارے کے تنقیدی عمل میں افادیت ان کا اولین معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ترقی پسند تنقیدی طریقۂ کار میں کافی حد تک فن پارے کا جمالیاتی اور فنی پہلو نظر انداز ہو جاتا تھا، یا پھر اسے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس حلقہ ارباب ذوق نے 'ادب برائے ادب' کے نظریے کو پروان چڑھایا، جس کی وجہ سے فن پارے کی جمالیاتی اور فنی جہت کو اہمیت حاصل ہوئی، اس کے بے رحم تجزیے کے رجحان کو فروغ ملا اور فن کے دائمی قدروں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ۔ حلقے کے ناقدوں نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا کہ فن پارے کی تنقید و تجزیے میں حسن و قبح کا فیصلہ کرنے میں ذاتی ذاتی پسند و ناپسند کے بجائے جواز مہیا کیا جانا چاہیے۔ تنقید و تجزیے کا یہ وہ طریقۂ کار تھا جو حلقۂ ارباب ذوق کی واضح شناخت کے طور پر ابھری۔ نتیجتاً حلقہ ارباب ذوق کی تنقید میں فن کا جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ ناقدوں نے اپنی تنقید اور تجزیے میں تخلیقات کی ان جہتوں کو دریافت کرنے کی کوششیں کیں جن کی بنا پر عالم انسانیت سے محبت کا جذبہ بیدار ہو، اور وہ کیفیت پیدا ہو جو روح کو بالیدگی عطا کرے۔

مجموعی اعتبار سے حلقہ ارباب ذوق کی تنقید کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں حلقے نے تاثراتی تنقید کو فروغ دیا اور فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کی تعیین کے لیے وجدان کو رہنما بنایا۔ دوسرے دور کا آغاز میراجی کی شمولیت کے بعد سے قرار دیا جانا چاہیے۔ جب میراجی نے ادب اور زندگی کے رشتے کا اثبات کرنے کی کوشش کی اور تنقید میں جمالیاتی جہت پیدا کی۔ حلقے کی تنقید کا تیسرا دور میراجی کے انتقال کے بعد شروع ہوا، جس میں ایک نسل اپنے فرائض تقریباً پورے کر چکی تھی۔ اسی دور میں نئے ذہنوں کے ساتھ حسن عسکری، ریاض احمد، وزیر آغا، انتظار حسین اور ناصر کاظمی سامنے آئے جنھوں نے تنقید میں ایک نیا رجحان پیدا کیا، استعاروں اور علامتوں کے نئے معنی دریافت کیے، اور ماضی کے قدیم ادب کی نئی تعبیر کے فرائض بھی انجام دیے۔ اسی دور میں حلقے کے چند ناراض نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے 'نئی تشکیلات' کے نام سے ایک چلائی۔ اس جماعت نے ترکیبی ہیئت کو تبدیل کر کے استعارے کے وسیلے کو دو حقیقتوں کے درمیان تقسیم کرنے کی کوشش کی س کے خلاف حلقے کے اندر سے ہی آواز اٹھی اور اسے غیر صحت منداور منفی تحریک کہہ کر رد کر دیا گیا۔ 1972 میں حلقے کی دو حصوں (ادبی اور سیاسی) میں تقسیم کے بعد حلقے کی تنقید بھی دو مختلف دبستانوں میں تقسیم بٹ گئی۔ ادبی حلقے نے حلقہ ارباب ذوق کے روایتی نظریوں کو برقرار رکھا اور شعر و ادب کی تفہیم کے لیے فنی تجزیے کو لازم قرار دیا۔ جب کہ سیاسی حلقے نے جس کا جھکاؤ نو ترقی پسندی کی جانب تھا مارکسی نقطۂ نظر پر عمل کرتا رہا۔

☆☆☆